ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۴۳

چوتھا سال: ساتویں کتاب

جولائی ۲۰۰۶ء

مراسلت: C/۵۴۵ گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey_90@hotmail.com
ویب سائٹ: www.apwn.net/urdu
فون: ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶
کمپوزنگ: اظہر خان، یونی کارن کمپوزرز، چونگی نمبر ۶، ملتان
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سیّد عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ ''معاملہ'' کی غزلیں — ڈاکٹر نجیب جمال — ۴
۳۔ کئی چاند تھے سرِ آسماں — غلام حسین ساجد — ۱۲
۴۔ ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوں کا لسانیاتی مطالعہ — پروفیسر مزمل حسین — ۱۷
۵۔ ادب سیاست اور تحریک — عابد میر — ۲۱
۶۔ اردو زبان اور جدید تقاضے — نبیل احمد نبیل — ۲۴

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی:

۷۔ پندرہ غزلیں — ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی — ۲۸

کہانیاں:

۸۔ آب.....سراب — ڈاکٹر عباس برمانی — ۳۶
۹۔ دو شرطیں — لیاقت علی — ۴۱

غزلیات:

۱۰۔ ظفر اقبال (بارہ غزلیں)، صابر ظفر (دس غزلیں)، قاضی حبیب الرحمٰن (ایک غزل)، خاور اعجاز (چھ غزلیں)، حفیظ شاہد (دو غزلیں)، سہیل غازی پوری (دو غزلیں)، مشتاق شبنم (دو غزلیں)، گفتار خیالی (دو غزلیں)، پرویز ساحر (ایک غزل)، کاشف مجید (دو غزلیں)، اوصاف نقوی (دو غزلیں)، عابد خورشید (دو غزلیں)، رومانہ رومی (دو غزلیں) — ۵۰ تا ۷۳

نظمیں:

۱۱۔ ''فسوں گردشِ ایام ہے'' (گفتار خیالی) ''اضطراب'' (مشتاق شبنم) ''زرد آسمان (مبشر مہدی) — ۷۴

حروفِ زر:

۱۲۔ قارئین کے خطوط — بنام مرتب — ۷۷

☆☆☆

سیّد عامر سہیل

چند باتیں

ہر روز بدلتے ہوئے حالات پر نگاہ ڈالیں، سیاسی، سماجی اور معاشی بدحالی کا تجزیہ کریں اور پھر اس تناظر میں تخلیق ہونے والے مجموعی ادب کا مطالعہ کریں تو یہ بات شدت سے محسوس کی جا سکے گی کہ ہمارا ادیب اپنے گرد و پیش ہی سے لاتعلق نہیں ہو گیا بلکہ وہ ادب اور اس کے منصب سے بھی نا آشنا ہو چکا ہے، خصوصاً ہمارا نوجوان لکھاری تو اس بے سمتی کا بری طرح شکار ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ادب اس سماج میں تخلیق ہونے کی بجائے خلاؤں میں تخلیق کیا جا رہا ہے۔ وہ بنیادی سوالات جن کے جوابات سننے اور پڑھنے کی توقع ادیب سے کی جاتی رہی ہے وہ انہی بنیادی سوالات سے ہی بے گانہ ہے۔ اور یوں بھی ادب میں نظریے اور کمٹ منٹ کو رد کرنے کا فیشن بھی چل پڑا ہے۔ اب لاجواب مباحث ہیں، بے مثال اصطلاحات کی بھرمار ہے، زبان، ہیئت، معنی اور ساخت کی بے شمار بحثیں ہیں مگر ایک ادیب اور ادب کا معاشرے کی کردار سازی میں کیا کردار ہو سکتا ہے، اس سے سبھی بے گانہ ہیں۔

۱۰ر جولائی کا سورج اپنے ساتھ کئی سانحات کو لے کر طلوع ہوا۔ اسی دن صبح نامور شاعر، افسانہ نگار، کالم نگار اور اردو ادب کے سینئر ترین ادیب جناب احمد ندیم قاسمی کے انتقال کی خبر آئی۔ یقیناً یہ اردو دنیا کے لئے بڑی دلخراش خبر تھی۔ قاسمی صاحب بلاشبہ ایک عہد ساز لکھاری تھے، ادب سے ان کا تعلق تقریباً ستر برس قائم رہا۔ ان کی تحریروں پر یقیناً ناقدین کام کریں گے مگر انہوں نے بہر حال ایک عہد کو ضرور متاثر کیا ہے۔

ابھی قاسمی صاحب کی خبر پر دوست افسوس کا اظہار کر ہی رہے تھے کہ ملتان کو خصوصاً ایک اور کرب سے گزرنا پڑا۔ ملتان سے لاہور جانے والی فوکر پرواز اپنی اڑان کے چار منٹ کے بعد حادثے کا شکار ہو گئی۔ اس حادثے نے بہت سے دوستوں اور اہم ترین شخصیات کو ہم سے جدا کر دیا۔ طیارے میں جہاں ڈاکٹرز، پاک فوج کے سینئر افسران اور اعلیٰ عدالتوں کے اہم جج شامل تھے وہاں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان کے وائس چانسلر جناب محمد نصیر خان (ستارہ امتیاز) اور بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں شعبہ اردو کے سینئر استاد جناب ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر عبدالرؤف شیخ نہ صرف اعلیٰ استاد تھے بلکہ اردو ادیب کے نہایت زیرک پارکھ بھی تھے۔ سید عابد علی عابد پر ان کا تحقیقی کام حوالے کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کئی کتابوں کے مصنف اور مرتب بھی تھے۔ اسی طرح وائس چانسلر جناب محمد نصیر خان بھی سائنس کے میدان میں اعلیٰ تحقیقی مقالات تحریر کر چکے تھے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی خدمات کے صلے میں حکومت نے انہیں ستارۂ امتیاز سے نوازا تھا۔ وہ اعلیٰ محقق کے ساتھ ساتھ ایک نہایت عمدہ منتظم بھی تھے۔ ان کی قیادت میں یونیورسٹی نے ترقی کی جو رفتار حاصل کی تھی وہ یقیناً قابل تقلید ہے۔ خدا تعالیٰ تمام مرحومین کو اپنی خاص رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)۔

ڈاکٹر نجیب جمال

''معاملہ'' کی غزلیں

''موسم''، ''عناصر''، ''کتاب صبح'' اور ''آئندہ'' کی شاعری اپنے مختلف النوع موضوعاتی اور اُسلوبیاتی تجربات کے باعث ہم سے مطالعہ کی پہلوداری کا تقاضا کرتی ہے۔ بالخصوص ''آئندہ'' کی شاعری ایک ایسے تخلیقی سفر کے بے اَنت ہونے کا استعارہ ہے جو ستّر کی دہائی میں شروع ہوا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ صاف صاف بات کرنے اور استعاروں کے بھید بھاؤ میں فرق تو ضرور ہے۔ اس فرق کو جاننے کے لئے شاعری کے مضامین کی تہ داری کو جاننا ضروری ہے اور تہ داری کو جاننے کے لئے شعر فہمی کے ساتھ مطالعہ کی پہلوداری کا ہونا بھی لازمی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ شاعری کبھی اپنے سارے اسرار کھول کر بیان نہیں کرتی اور نہ ہی اس کیف کا مکمل پتہ دیتی ہے جو اس کے ریشوں میں سرایت کئے ہوتا ہے اور جسے وہ غیر محسوس طور پر ہر باذوق قاری میں بہ قدر شوق منتقل کر دیتی ہے۔ شاعری کو جاننے کے لئے سخن فہمی ایک الگ تقاضا ہے حالاں کہ ہماری تنقید سخن فہمی سے زیادہ طرف داری پر انحصار کرتی ہے اب یہ الگ بات کہ اچھی شاعری کے لئے تنقید یا تحسین کی اتنی ضرورت نہیں جتنی تنقید یا تحسین کے لئے اچھی شاعری کی ضرورت پڑتی ہے اس لحاظ سے یہ سطور لکھتے ہوئے میں ایک احساس مسرت (کسی مروت کے بغیر) کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ پچھلی دو دہائیوں سے ''موسم''، ''عناصر''، ''کتاب صبح'' اور ''آئندہ'' کے شاعر غلام حسین ساجد کی غزل نہ صرف احساس تازہ کی صورت رکھتی ہے بلکہ موضوعات و تجربات کا بھی ایک خوش گوار اور تحیر آمیز فنون ان غزلوں کی پہچان ہے۔

غلام حسین ساجد کی شعری ریاضت نے اب جس تسلسل خیال اور ارتکاز معنی کی صورت اختیار کر رکھی ہے ''معاملہ'' کی غزلیں اس کی توسیع ہیں۔ ''معاملہ'' کی غزلوں میں جس ردیف کو مستقل حیثیت حاصل ہے اس کی صوری و معنوی تشکیلات پر بڑی تفصیل سے بات ہو سکتی ہے اس ردیف میں میرؔ نے اٹھارھویں صدی میں ایک بہت عمدہ غزل کہی تھی جس کا یہ شعر تو آج بھی نہ صرف جدید معلوم ہوتا ہے بلکہ مابعد جدید کی پوری بحث اس ایک شعر کے حوالے سے سمیٹی جا سکتی ہے۔ دیکھیے

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

میرؔ کا یہ شعر جن مباحث کو جنم دیتا ہے وہ بھلے ہی اب پرانے ہو چکے ہوں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میرؔ نے اس شعر کے ذریعے وحدت و کثرت کے درمیان تعینات کے پردے اٹھا دیئے تھے یہی نہیں بلکہ تنقید کے لئے بھی خیالات کے ایک نئے نظام کو بنیاد فراہم کی تھی جس کے ذریعے سے ہی ایک اعلیٰ تخلیقی دور وجود میں آتا ہے۔ میرؔ نے اپنے عہد کو ایک نئی شعری زبان بھی عطا کی تھی

جس کا لحن اور لہجہ اس وقت سماجی زبان اور گفتگو سے قریب تر تھا۔ آج شاید تین صدیوں کے بعد اسی ردیف، اسی سماجی زبان اور مانوس لہجے میں غلام حسین ساجد نے 'معاملہ' کی غزلوں کو ترتیب دیا ہے اور بالکل میرؔ کے انداز میں غزل کی زبان کو غزل کی ہیت سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ 'معاملہ' کی غزلوں میں بڑی تعداد ایسے اشعار کی ہے جس میں خالص انسانی صورت حال کو موضوع بنایا گیا ہے یہ حصہ اس مجموعے کا طاقت ور ترین حصہ ہے اور وہ اشعار جن میں اخلاقی، ماورائی، روحانی فلسفیانہ یا سائنسی توجیحات نظر آتی ہیں انہیں اس کتاب کا کمزور حصہ سمجھا جا سکتا ہے تاہم غلام حسین ساجدؔ کا خالص شاعرانہ احساس ہر جگہ دیکھا جا سکتا ہے جو اس کی فطری تخلیقی صلاحیتوں کو ظاہر کرتا ہے۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کہ غلام حسین ساجد کے تخلیقی سفر میں 'معاملہ' کی غزلیں اس لمحے کی تخلیق ہیں جب اس کی شعری ریاضت اور تخلیقی وفور متوازی طور پر اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعوں میں موجود صاف دکھائی دیتے ہیں اور اس سے بھی سوا فنی اقدار ایک غیر محسوس مگر قابل عمل طریقے سے ان اشعار سے جڑی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ لمحہ ہر اچھے اور بڑے شاعر کی فنی زندگی میں ایک مرتبہ ضرور اپنا رنگ جماتا ہے تاہم عموماً دیکھا یہ گیا ہے کہ پھر اس کے بعد ریاضت اور فنی پختگی تو بڑھتی جاتی ہے مگر تخلیقی وفور بتدریج کم ہوتا جاتا ہے۔ غلام حسین ساجد کی گرفت میں آج وہ لمحہ ہے جس میں آرٹ اور کرافٹ آپس میں اس طرح جُڑ گئے ہیں کہ ان کی الگ الگ پہچان باقی نہیں رہی ہے۔ آج کل جو غزلیں وہ کہہ رہا ہے ان میں مشکل ردیفوں اور پیچیدہ قافیوں کے باوجود روانی (Spontaneity) برجستگی (Fluency) اور تازگی (Vividity) قابل لحاظ حد تک خوش کن ہے ناممکن ہے کہ اس میں ثقافت، پژمردگی اور تنگ نائے کا شائبہ بھی دکھائی دے، سبب اس کا یہ ہے کہ اس کا شعری تجربہ ہمیشہ سے وسعت پذیر رہا ہے اور اس میں شعریت کے ساتھ ساتھ موضوعاتی اور اسلوبیاتی تنوع کسی نہ کسی حد تک قابل شناخت رہا ہے اور اب وہ ''موسم''، 'عناصر'، کتاب 'صبح' اور 'آئندہ' کے تجربات کی طرح ''معاملہ'' میں بھی نئی طرح کے معاملات اور تجربات کو پیش کر رہا ہے۔ اسی نوع کے تجربے پر مشتمل جدید طرز احساس کے شاعر صابر ظفر کا شعری مجموعہ بہ عنوان ''نامعلوم'' ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے جس میں ساٹھ غزلوں کو ایک ردیف 'معلوم' اور ایک ہی بحر میں لکھا گیا۔ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ان غزلوں کی موضوعاتی اور ساختیاتی اساس شادؔ عظیم آبادی کی یہ معروف غزل رہی ہوگی جس کا مطلع ہے۔

اسیر جسم ہوں معیاد قید لا معلوم یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

صابر ظفر نے بھی شادؔ کی طرح وجود کی غایت کو کبھی حریت کبھی دلچسپی کبھی امکانات اور کبھی تشکیک کے طور پر دیکھا ہے اب اس کا کیا کیا جائے زندگی بجائے خود ایک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا تو سوال تو اٹھتے رہیں گے جواب بھی دیئے جاتے رہیں گے میرؔ صاحب نے تو خود ہی سوال کر کے اور خود ہی جواب دے کر بات ہی ختم کر دی تھی کہ

میں کون ہوں اے ہم نفساں، سوختہ جاں ہوں
اک آگ میرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں

مگر بات یہاں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ اور آگے بڑھتی ہے۔ ہر گزرنے والا دن ایک نیا سوال چھوڑ جاتا ہے۔ صابرؔ ظفر کو بھی اس بے حد و حساب فسانہ زندگی کے نئے سوالات، نئی حیرتوں اور نئی بوالعجبیوں کا سامنا ہے وہ بھی فانیؔ کی طرح حکایت ہستی کی واقعیت کو صرف درمیان ہی سے سُن سکا ہے یہ درمیانی لمحہ وصال و ہجر، روح و بدن، خیال و حقیقت، ازل و ابد، معلوم و نامعلوم اور وجود و عدم کے درمیان کا معما ہے دیکھیے

میں صرف ہوتا ہوں حتی کہ میں نہیں رہتا
نہ ہو یہ کاش کسی کو ترے سوا معلوم
ہے کائنات بدن، عشق کائنات کی روح
نہیں ہے روح و بدن سے مجھے سوا معلوم
ازل ازل سے ابد سے ابد ہوا معلوم
جو میں نہیں تھا تو کیسے ہوا خدا معلوم
بہت دنوں سے نہیں مل رہے ہیں خود کو بھی
خبر کرو جو ہمارا ہو کچھ پتا معلوم
وجود کیا ہے عدم کیا ہے کچھ نہ تھا معلوم
میں رو برو تھا کسی کے، تھا کون، کیا معلوم

اسی حکایت کو قافیے اور ردیف کی تبدیلی کے ساتھ غلام حسین ساجد نے بھی سنایا ہے اس کی ردیف ''ہمارے بیچ'' ہے اور اس نے یہ حکایت پندرہ طویل غزلوں میں رخ بدل بدل کے سنائی ہے۔ ''معاملہ'' کی چار سو اٹھانوے اشعار پر مشتمل ان غزلوں میں پہلی غزل ہی اکہتر اشعار پر مشتمل ہے جہاں تک صابرؔ ظفر کے شعری مجموعے ''نامعلوم'' کی اشاعت کا تعلق ہے اسے زمانی اعتبار سے تقدم تو حاصل ہے تاہم یہ بھی امر واقعہ ہے کہ غلام حسین ساجد کا شعری مجموعہ گزشتہ ڈیڑھ برس سے میرے پاس دیباچہ لکھنے کے لئے رکھا ہے مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ صابرؔ ظفر اور غلام حسین ساجد کے درمیان اشتراک فکر و نظر کا یہ معاملہ کوئی حقیقی یا ٹھوس اساس رکھتا ہے یا نہیں لیکن دونوں کے کلام کی داخلی شہادتوں کی بنا پر میرا گمان بحد یقین ہے کہ عہد جدید کے ان دونوں اہم شعراء کے یہاں فکری، موضوعاتی اور ساختیاتی حوالے سے تبادلہ خیال یا ربط باہمی کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور موجود رہی ہے کیوں کہ 'معلوم' اور 'معاملہ' کی غزلیں ایک ہی سلسلہ خیال اور لفظ و معنی کے اتصال کی توسیعی صورت دکھائی دیتی ہیں۔

غلام حسین ساجدؔ کے شعری و فنی تجربوں کو پہلے بھی ایک مختلف طرز احساس اور ایک منفرد شعری پیرایہ اظہار کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے خاص طور پر شعری اسلوب کو مخصوص اصطلاحی نام بھی دیا جاتا رہا

ہے اس انداز کی غزل لکھنے والے دوسرے شعراء ثروت حسینؔ، خالد اقبال یاسرؔ، محمد اظہار الحقؔ اور محمد خالد کے ساتھ غلام حسین ساجدؔ کا تذکرہ بھی عام طور پر ہوتا رہا ہے۔ تاہم غلام حسین ساجدؔ کئی لحاظ سے اپنے معاصرین شعراء سے کسی قدر مختلف بھی ہے ایک تو اس کا ہر شعری مجموعہ موضوعاتی اعتبار سے بھی ایک الگ مزاج رکھتا ہے اور دوسرے وہ حسب ضرورت اور حسب ذوق اپنے لہجے کی حلاوت و ملاحت میں کمی بیشی کر لیتا ہے۔ اسی طرح تجربے کا اکھوا کبھی اس کے اندر سے پھوٹتا ہے تو کبھی اس کا منبع خارج ہوتا ہے اسی نسبت سے اس کے ہر مجموعے کے مضامین اور اسالیب مخصوص تجربیت کے حامل ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے قاری سے ہر مرتبہ ایک نئے زاویے اور ایک نئی تیاری کے ساتھ اپنی شاعری کے مطالعے کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ تقاضا کچھ اتنا بے جا بھی نہیں کہ ہم 'موسم'، 'عناصر'، 'کتاب صبح' اور 'آئندہ' کے تجربوں اور لہجوں سے تو پہلے سے ہی آگاہ ہیں۔

''معاملہ'' اردو زبان میں غلام حسین ساجدؔ کا پانچواں شعری مجموعہ ہے بظاہر تو یہ مجموعہ اس کے اب تک کے آخری مجموعے ''آئندہ'' کے لہجے اور لفظیات کی توسیع معلوم ہوتا ہے تاہم اس تسلسل اور توسیع میں بھی اسلوب کا ایک نیا امکانی تصور دیکھا جا سکتا ہے اس نسبت سے 'معاملہ' کا شعری پیرایہ بھی کسی اور شعری مجموعے کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا ہے۔ ''معاملہ کی غزلوں کے مضامین بھی معاملہ بندی کے روایتی رنگ و آہنگ سے جداگانہ مفہوم رکھتے ہیں اردو غزل میں یہ معاملہ جنس مخالف سے تعلق رکھنے والے دو انسانوں کے مابین لطف و عنایات اور حرف و حکایات کا قصہ لذیذ رہا ہے اور اس کا تصور ہی ہر اہلِ دل کو سرشار رکھتا ہے حسن و عشق کی دنیا کہانی کے ان کرداروں سے مزین ہے جن کی ہر آئینے میں ایک سی صورت دکھائی دیتی ہے غلام حسین ساجدؔ نے آئینے کے علاوہ بھی کچھ اور علامتوں اور تمثالوں کے ذریعے بات کی ہے وہ رنگ، خواب، چراغ، پھول، آنکھ اور منظر جیسے لفظوں کو رنگوں اور خوشبوؤں میں بسی فضا کی تصویری مظہریت کو نمایاں کرنے میں صرف کرتا ہے۔ غالبؔ نے جس مرحلے پر اپنی عمر کو ''صرفِ بہار حسن یار'' کرنے کا دعویٰ کیا تھا غلام حسین ساجدؔ بھی اسی مرحلے پر کھڑا دکھائی دیتا ہے جہاں بہار حسن کا مفہوم ایک چھوٹے دائرے سے نکل کر بڑے دائرے میں داخل ہوتا ہے اور جہاں کائنات، فطرت، مابعد الطبیعات اپنے ارتقا کی حالتوں سے گزر کر لمحہ حال میں اس لئے زیادہ قابل فہم سمجھے جاتے ہیں کہ اب شعور، لاشعور، حواس، ماورائے حواس سب عوامل ایک دوسرے کی تفہیم میں معاون بن چکے ہیں اس پس منظر میں ''معاملہ'' کی شاعری ایک بالکل مختلف معاملے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

'معاملہ' میں شامل تمام غزلوں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں ردیف ''ہمارے بیچ''، مسلسل ربط دروں پیدا کئے ہوئے ہے اور اگر اختلاف قافیہ نہ ہوتا تو پوری کتاب ہی ایک مسلسل غزل کی صورت اختیار کر لیتی تاہم اس اختلاف ظاہری کے باوجود پورے مجموعے میں تسلسل خیال و فکر موجود ہے مجموعے کے سرنامے کے طور پر جو مصرعہ دیا گیا ہے وہ معاملے کی نزاکت کو سامنے لانے کے لئے بہت ہے۔ مصرع ہے

معاملہ ہے کوئی اور ہی ہمارے بیچ

یہاں ردیف ''ہمارے بیچ'' ''معاملہ ہے کوئی اور'' کی معنوی تفہیم کرتی دکھائی دیتی ہے اور وہ اس طرح کہ ''ہمارے بیچ'' دو آدمیوں کے درمیان معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ معاملہ بدن اور روح کا بھی ہو سکتا ہے۔ اطراف کا بھی ہو سکتا ہے افقی وسعتوں اور عمودی گہرائیوں کے بیچ کا معاملہ بھی ہو سکتا ہے۔ آسمان اور زمین کے بیچ کائنات کے جو اسرار ہیں زندگی کے جو بھید ہیں فطرت کے جو بھاؤ ہیں، اسی معاملہ کا حصہ ہیں ذرا سوچیے کہ وداع و وصل کے بیچ، عشق اور حسن کے بیچ، مشاہدہ حق اور بادہ و ساغر کے بیچ جو سلسلہ ہائے دراز کا قصہ ہمیشہ سے ہر شخص اپنی بساط کے مطابق سنانے کی کوشش کر رہا ہے کیا یہ سب کچھ بے بنیاد ہے کون نہیں جانتا کہ مریض محبت تو ہمیشہ سے فسانہ محبت دم نکلتے نکلتے سناتا ہی رہا ہے اس میں نئی بات، متوجہ کرنے والی بات اور حیران کرنے والی بات کیا ہے۔ یہی بات 'معاملہ' کی شاعری پڑھتے ہوئے مجھے بھی پریشانی کی طرح بلکہ شاید عشق کی طرح لاحق تھی باوجود یہ کہ میں غلام حسین ساجدؔ کی جدت پسندی سے آگاہ تھا اور اس کی شاعری سے آشنائی کا دعویدار بھی تھا اور کچھ کچھ طرف دار بھی۔ پھر بھی میرے خیال میں اس مرتبہ موسم، عناصر، کتاب صبح اور آئندہ جیسے مختلف النوع شعری مجموعوں کے خالق نے ایک مشکل اور دشوار مرحلے سے گزرنے کا سوچا تھا پھر کئی اشعار سے گزرتے ہوئے اچانک میری نظر اس کے اس مصرعے سے ہم کنار ہوئی

کھڑا ہے کون یہ رنگیں ادا ہمارے بیچ

تو یوں مجھ پر 'معاملہ' کی حقیقت کھلنا شروع ہوئی۔ یہ تو سارا معاملہ ہی تکوینی نکل آیا۔ یہ درمیان میں جو کوئی بھی ہے یہی تو کائنات کی رمز ہے یہی تو عشق کی غریب و سادہ داستان کی رنگینی ہے سیدھی سادی کہانی کا بیچ و خم ہے یہی تو وہ اضطراب ہے جو مابین من و تو یکجائی اور یگانگت میں خلل ڈالتا ہے یہی تو وہ فتنہ ہے جو زاہد کی ساری عمر کی ریاضت کو ایک ثانیے میں خاک میں ملاتا ہے یہی تو عشق کی واردات کو ایک نیا عنوان، ایک نیا رخ اور ایک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑ دیتا ہے اس کے بعد میں نے 'معاملہ' کو دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو میرے سامنے ساتواں در کھلا ہوا تھا۔

غلام حسین ساجد نے اب 'معاملہ' کی بعض پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی گتھیوں کو بھی سلجھانا شروع کیا اور کیف و کیفیت میں بھی مبتلا کئے رکھا مجھے نہیں معلوم کہ حسن و عشق کے نئے تلازمے اس کی فنی ریاضت کا ثمر ہیں یا یہ اس پر نازل ہوئے ہیں۔ بہر صورت 'معاملہ' کی تفصیل دل چسپ بھی ہے اور معنی یاب بھی۔ اس میں خیال کی تازگی اور فکر کی شگفتگی بیک وقت موجود ہے اور لطف یہ ہے کہ سلسلہ خیال کی موج کہیں رکنے نہیں پاتی۔ اس نے شاعری کی زمین کو ہموار کر دیا ہے ہاں اس میں موڑ ضرور آتے ہیں مگر ہر موڑ پر سامنے ایک نیا راستہ اور ایک نیا منظر دکھائی دیتا ہے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ مصرعے اس طرح تراشے گئے ہیں کہ ہر مصرعے میں ایک نئے چہرے کے نقش دکھائی دیں۔ یہ مصرعے سبک اور ملائم پردے ہیں جو

ایک ایک کر کے اٹھتے جاتے ہیں اور ہر بار سٹیج پر ایک نیا منظر سامنے آتا ہے۔ اور پھر وہی تماشا شروع ہو جاتا ہے جس میں مابین من وتو ایک نئی اڑچن ایک نئی صورت احوال اور ایک نئی نوکیلی اور ترچھی چٹان کھڑی دکھائی دیتی ہے ایک نئی گھاٹی، ایک نیا فراز ایک نیا نشیب ایک نئی تشکیک ایک نیا الہام اور ایک نیا دھوکا سامنے آجاتا ہے کیوں، کیسے، کب، کون، کوئی اور کہاں جیسے افتاد بیچ میں آپڑتی ہے اور اندھیرا اتر آتا ہے لیکن پھر درمیان میں ایک دیا جلتا ہے، روشنی پھوٹتی ہے نور بکھرتا ہے رابطہ بحال ہوتا ہے فاصلے سمٹتے ہیں، دوری مٹتی ہے اور آسانیاں پیدا ہوتی ہیں تکوین تو کیا مابینِ من وتو شنویت بھی باقی نہیں رہتی۔ اب ذرا ان اشعار کو دیکھیے اور محسوس کیجئے کہ محسوس اور ماورائے حواس کیفیتوں اور طبعی اور مابعد الطبعی تجربوں کے بیچ کیسے کیسے سوال اور کیسے کیسے مرحلے درپیش ہوتے ہیں:

نہیں ہے کوئی اگر سلسلہ ہمارے بیچ
تو کیوں پڑی ہے یہ خلقِ خدا ہمارے بیچ

فضا صباحتِ موجود سے منور ہے
کہ رکھ دیا ہے کسی نے دیا ہمارے بیچ

پلٹ کے اپنے بدن پر نگاہ پڑتی ہے
دھرا ہوا ہے کوئی آئینہ ہمارے بیچ

کوئی چراغ جلے گا اسی اندھیرے میں
بحال ہوگا کبھی رابطہ ہمارے بیچ

ہم ایک دوسرے سے دور ہوتے جاتے ہیں
ہے کوئی اور بھی موجود کیا ہمارے بیچ

ہم اپنے آپ سے نزدیک بھی ہیں دور بھی ہیں
نہیں ہے کوئی ہمارے سوا ہمارے بیچ

نقاب اس نے اٹھایا ہے اپنے چہرے سے
کہ رنگِ قریہ حیرت کھلا ہمارے بیچ

جو میری آنکھ میں ہے اور تری ہتھیلی پر
ہے مشترک یہی رنگِ حنا ہمارے بیچ

گریز کرنے لگے ہیں خود اپنے آپ سے ہم
نہیں ہے آج کوئی دوسرا ہمارے بیچ

یقیں نہیں ہے ہمیں عشق کے اثاثے پر
کہ پل رہا ہے فقط وسوسہ ہمارے بیچ

قدم دھرے گا وہ اس خاک داں پہ بھی اک روز
بسر کرے گا وہ اک ثانیہ ہمارے بیچ

بدل کے دیکھیں گے قالب کسی چراغ سے ہم
نمود پائے گی جب سیمیا ہمارے بیچ

گواہ عشق پہ رکھا نہیں زمانے کو
ہمارے بیچ تھا جو کچھ رہا ہمارے بیچ

نہیں ہے بچ کے نکلنے کا راستہ کوئی
بکھر گیا ہے کوئی جا بجا ہمارے بیچ

بھٹک رہے ہیں ابھی ہجر کے دیار میں ہم
کھلے گا پھول کبھی وصل کا ہمارے بیچ

ہم اپنے عشق میں سچے تھے اور سچے ہیں
فقط انا تھی جو آتی رہی ہمارے بیچ

ظہور کرنے لگی پھر زمیں ہمارے بیچ
مجھے یقیں تھا کوئی نہیں ہمارے بیچ

وہ بے قرار نگاہیں وہ جاگتی آنکھیں
کہیں سے چل کے کہاں آگئیں ہمارے بیچ

بکھر چکی ہیں کسی دشت خواب میں کب کی
وہ کہکشائیں جو کچھ دیر تھیں ہمارے بیچ

جمال اپنا دکھائے گا دشت حیرت میں
کھلا نہیں ہے جو رنگ سحر ہمارے بیچ

فروغ پانے لگیں تلخیاں ہمارے بیچ
پھر آگیا ہو نہ وہ آسماں ہمارے بیچ

رُکا ہوا تھا کسی خواب کے جھروکے میں
مہک اٹھا ہے جو اک گلستاں ہمارے بیچ

بھٹکتے رہتے ہیں اک دائرے میں چلتے ہوئے
چراغ و آئینہ و شمع داں ہمارے بیچ

رکتے نہیں کسی بھی گلی میں زیادہ دیر
رکھی گئی ہے رسم مسافت ہمارے بیچ

آیا ہے نخل جسم پر اک خوش جمال رنگ
مہکا کسی کے روپ کا چندن ہمارے بیچ

ہم اپنے اپنے کنج سے باہر نہ آسکے
بے طرح پھیلتا گیا جنگل ہمارے بیچ

دریا نکل گیا تھا کہیں پھیلتا ہوا
صحرا کہیں سے آن کے سمٹا ہمارے بیچ

تمام عکس سمیٹیں گے اس پری وش کے
اک آئینہ ہے ابھی تازہ دم ہمارے بیچ

ان اشعار سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ایک معاملہ جو دوفریقین کے بیچ من وتو کی دوری کے باوجود پیدا ہوا تھا مگر جس میں ذاتی انا کو مٹانا شرط اولین تھا اور جس میں زمانے کو ایک غیر ضروری فریق سمجھا گیا تھا۔ کہ من وتو کے درمیان کسی شے کی کوئی حقیقت تسلیم نہیں کی جاتی مگر انسانوں کی اس بستی میں تفریق جس کا خاصا ہے یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ زمانہ اپنی چال نہ چلے اندیشے پیدا نہ کرے بدگمانیوں کو جنم نہ دے وسوسے نہ ڈالے واہموں میں مبتلا نہ کرے چناں چہ عشق اگر دوئی کو مٹاتا ہے تو زمانہ دوئی کو پھر سے جنم دیتا ہے اور یوں تجدید تعلقات کے امکانات محدود ہوتے چلے جاتے ہیں 'معاملہ' کی غزلوں میں یقین واماں اور وہم وگماں کے درمیان پھنسی ہوئی اس حالت کی تصویریں بڑی واضح اور حقیقی ہیں۔

''معاملہ'' کی غزلیں مختلف قوافی کے دروبست میں مقید ہیں اس لئے ان غزلوں کے موضوعات بھی غزل کی ہیت حاکمہ کے پابند دکھائی دیتے ہیں ان مضامین کو کسی ترتیب یا تسلسل کا پابند نہیں کیا جاسکتا ان مضامین میں حسن وعشق کی کشمکش کا بیان البتہ ان حوالوں سے کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی واسطے سے اس معاملے کا لازمہ رہے ہیں تاہم غلام حسین ساجد نے اس ساری روداد کو حد درجہ نارمل انداز میں اور انسانی رویوں کے حوالے سے سنایا ہے یہ مختلف حوالے کبھی انا تو کبھی خود پرستی، کبھی رشک تو کبھی حسد، کبھی تمنا تو کبھی حسرت، کبھی اختیار تو کبھی مجبوری، کبھی شوخی تو کبھی معصومیت، کبھی زمانہ تو کبھی ذات، کبھی آسودگی تو کبھی خلش، کبھی خلق خدا تو کبھی خالق، کبھی دیا تو کبھی آئینہ، کبھی خواب تو کبھی رنگ خواب، کبھی قریہ حیرت تو کبھی غیر ذات، کبھی بادصبا تو کبھی گلستان، کبھی زمین تو کبھی خلا، کبھی تخلی تو کبھی دعا، کبھی نگر تو کبھی قرطبہ، کبھی رنگِ حنا تو کبھی بندقبا، کبھی صوت تو کبھی صدا، کبھی وسوسہ اور کبھی اندیشہ، کبھی ملک سبا تو کبھی شہر بے وفا، کبھی بیم تو کبھی رجا، کبھی ناروا تو کبھی روا، کبھی آسمان تو کبھی خاکدان، کبھی دیوتا تو کبھی پرماتما، کبھی محسوس تو کبھی ماورائے حواس، کبھی ولولہ تو کبھی واہمہ، کبھی بے جا تو کبھی جا بجا، کبھی رنگین ادا تو کبھی بس روا، کبھی ہجر صورت تو کبھی وصل سا، کبھی ہوا تو کبھی غبار سا، کبھی مسئلہ تو کبھی زمزمہ، کبھی رابطہ تو کبھی رت جگا، کبھی خالق تو کبھی خلق، کبھی حصار خواب تو کبھی نیند، کبھی عدم تو کبھی وجود، کبھی دھوپ تو کبھی رنگ ونور کی

صورت ''معاملہ'' کی غزلوں کے اشعار میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں مجھے معاف کیجئے یہ فہرست ابھی نا تمام ہے اور میں اسے طول نہیں دینا چاہتا ورنہ صورت یہ ہے کہ یہ شماریات 'معاملہ' کی پہلی غزل سے دی گئی ہے میں چاہوں بھی تو جگنوؤں، ستاروں، کہکشاؤں اور خوابوں کو اپنی مٹھی میں بند نہیں کر سکتا ویسے بھی ٹھوس اور جامد حقیقتوں پر تو طویل گفتگو کی جا سکتی ہے مگر خواب و خیال کی رعنائیوں اور کیفیتوں کو یا واردات کی تہ بہ تہ صداقتوں اور تجربے کی داخلی نوعیت کو بیان کرنا شاید کبھی بھی آسان نہیں رہا۔ میں خود بھی غلام حسین ساجد کے ہی ایک شعر کے مطابق ان لوگوں میں سے ایک ہوں جو اس لمحے اس کا کمال فن دیکھنے کے لئے چلتے چلتے رُک کے کھڑے ہیں۔

بہت سے لوگ رکے ہیں یہ دیکھنے کے لئے میں زخمِ عمر کو کیسے کمند کرتا ہوں

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ اب تک بند پڑے ہوئے معاملات شوق کے کتنے در اور کھولتا ہے کتنی کہانیاں اور سناتا ہے کتنے فسانے اس کے حواس کی گرفت میں اور ہیں۔ ابھی تو اور بہت سے معاملات بیان ہونے ہیں غزل کے بھی اور ماورائے سخن بھی۔ خیال وصل سے ماورا بھی اور آلام ہجر سے ماورا بھی، حقیقتوں سے ماورا بھی اور حواس سے ماورا بھی۔ ان میں سے کچھ تو 'معاملہ' کے اشعار میں بیان ہو گئے ہیں اور کچھ اس کے بعد ادا ہوں گے۔ یہ صحیح ہے کہ 'معاملہ' کی شاعری پڑھتے ہوئے میں غلام حسین ساجد سے خواب و خیال اور من و تو کے درمیان پھیلے ہوئے سلسلوں سے سوا کوئی اور تقاضا نہیں رکھتا تھا مگر ان اشعار میں فکر دنیا، غم معاش اور تلاش رزق کے حوالے کسی شعوری کاوش کے بغیر 'ہمارے بیچ' آ جاتے ہیں۔ تب مجھے لگا کہ اُس نے کھڑکی نہیں بدلی منظر بدلے ہیں۔ غزل کی تنگ نائے میں وسعت اور کشادگی کی جستجو اور وہ بھی ایک ہی ردیف کی پابند غزلوں میں زمین و آسمان کی حدیں ناپتا ہوا خیال آرائی اور معنی آفرینی کا تنوع گرمئی نشاط تصور کے سبب ہی ممکن ہے۔

☆☆☆

غلام حسین ساجد

کئی چاند تھے سرِ آسماں

اکیسویں صدی کے پہلے عشرے میں اُردو ناول کا معیار اور صورت کیا ہونی چاہیے؟ شمس الرحمٰن فاروقی کا ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسمان'' انہی سوالوں کا جواب لے کر سامنے آیا ہے۔

خدا کی بستی، آگ کا دریا، اداس نسلیں، خوشیوں کا باغ سے فائر ایریا تک اردو ناول میں موضوع، زبان اور اسلوب کی سطح پر کئی تجربے سامنے آئے ہیں اور اردو ناول نے سماجی حقیقت نگاری سے تجریدیت تک کا سفر طے کرنے میں بجا طور پر ساٹھ برس لیے ہیں مگر ''غالب افسانہ'' سے غالب کے عہد کے افسانے کی تفصیل میں جاتے ہوئے اس نے بمشکل دو برس کا وقت لیا ہے۔ مگر نہیں! اِس ناول نے وجود میں آنے کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کی زندگی کے ساٹھ برس ضرور لیے ہوں گے۔ کیوں کہ اس قدر تحقیقی صداقت، لسانی فراست اور تخلیقی اُپج کے باوصف بیانیہ کی رفعت کو چھوتی ہوئی اور تاثیر اور جمال سے بھری ہوئی اور اپنے کناروں کو بار آور لفظیات اور حسنِ ادا سے مسلسل وسعت دیتی ہوئی نثر اس سے پہلے یقیناً نہیں لکھی گئی۔ مجھے اصرار ہے کہ ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' زبان و بیان کی سطح پر صریحاً ایک ادبی معجزہ ہے۔

اُردو کے ابتدائی نقوش سے اس ناول میں برتی گئی زبان میں جس قدر زمانی بُعد ہے۔ اس کی حقیقت کو جاننے کے لیے کسی تحقیقی کتاب سے مدد لینے کی ضرورت ہے نہ ہی کسی طرح کے لسانی مباحثے میں الجھنے کی۔ اس بھید کو پانے کے لیے شمس الرحمٰن فاروقی کے اس ناول کا ایک بار مطالعہ کر لینا ہی کافی رہے گا۔ کیوں کہ اس میں زبان کی وہ ساری پرتیں کام میں لائی گئی ہیں، جن سے آگاہ ہوئے بغیر اس ناول کے عہد کا تہذیبی مرقع کھینچنا ممکن ہو سکتا تھا نہ ہی اس عہد کے مکینوں کے باطن سے آگاہی حاصل کرنا۔

مگر کیا کسی ناول کو صرف عمدہ اور ہر طرح کے قصے کے بیان کے لیے موزوں زبان کے استعمال کی بنا پر اچھا یا بڑا ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاید نہیں؛ اس لیے کہ اچھی زبان مصنف کے مافی الضمیر کو بیان کرنے کا بہتر وسیلہ ضرور بن سکتی ہے مگر مافی الضمیر کی ندرت اور فکری سطح میں اضافے کا نہیں۔ ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کی زبان، فاروقی کی قدرتِ کلام کا ثبوت ضرور ہے مگر اس ناول کا اصل اعجاز اس ناول کے پلاٹ کی چُستی، واقعات کو سانس لینے کی بھی مُہلت نہ دیتی ہوئی کشاکش، کردار نگاری اور قصے کی بے مثال بُنت ہے۔ اس ناول کے سوا آٹھ سو صفحات میں شاید ایک سطر، ایک لفظ بھی غیر ضروری نہیں اور ہر لفظ کے لکھے جانے اور استعمال میں لائے جانے کی قصے میں کہیں نہ کہیں کوئی وجہ ہے ضرور۔ اپنی اصل میں یہ ناول نثر سے زیادہ شاعری کے اوصاف سے مملو ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس ناول کے ذریعے آج کی تخلیقی نثر کی شعریات کو مرتب کیا ہے اور اپنے عصر کے دوسرے نثر نگاروں کے لیے

اس معیار سے گریز یا تجاوز کرنے کے راستوں کو یک بارگی بند کر دیا ہے۔ اس ناول کی لسانی سطح اور تخلیقی رفعت کا جواب شاید کبھی فاروقی ہی کا کوئی اور ناول ہو سکے گا۔ بشرطے کہ وہ کوئی اور ناول کبھی لکھیں تو۔۔!

''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' تاریخی ناول نہیں کیوں کہ اس کے کردار تاریخ کو بدلنے کے دعوے دار ہیں نہ اس نوع کا کوئی دعویٰ کرنے کے حق دار۔ یہ ہندوستان کی قسمت کے بدلنے کا وقت ہے ضرور مگر اس ناول کے مرکزی کردار اس تبدیلی میں کوئی خاص کردار ادا کرنے پر قادر نہیں۔ دراصل اس ناول کی بنیاد تاریخی حقائق پر ہونے کے باوجود اس کا مقصد تاریخی صداقتوں کو بیان کرنا نہیں۔ ہاں! اس میں تاریخی جدلیات کا مطالعہ بہر طور کیا گیا ہے مگر تاریخ کو بیان کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی نیت سے نہیں۔ شاید اس ناول کو تحریر کرنے کا اصل مقصد وزیر خانم (شوکت محل) کی داستانِ حیات کا احاطہ کرنا اور اس کے وجود کی کُنہ کو پہنچنے کے لیے، اس کے خاندان کی بنیاد تک پہنچنا اور اسے اپنے قارئین پر عیاں کرنا ہے۔ اس قصے کے انتخاب کرنے کی وجوہ کیا ہیں اور شمس الرحمٰن فاروقی کو وزیر خانم کی داستانِ حیات کو اس قدر تحقیقی صداقت اور تخلیقی اُپج کو کام میں لا کر لکھنے کی ضرورت کیوں آن پڑی؟ مجھے معلوم نہیں مگر کیا قاری کے لیے ہر ناول نگار کے ذہنی رویوں کا جاننا ضروری ہے؟ اس قصے کے انتخاب کرنے کی وجہ کوئی بھی ہو۔ اس کے مرکزی کردار کے ذریعے اس زمانے کی اشرافیہ کی سبھی پرتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ کیوں کہ وزیر خانم کا سفر متوسط طبقے سے فرنگی اشرافیہ اور روایتی نوابوں سے ہوتا ہوا بالآخر ولی عہدِ سلطنت، کشورِ ہندوستان کی خواب گاہ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس زمانے کی فکر، حقیقت اور کُنہ کو جاننے کے لیے شاید کسی اور کردار کا انتخاب اس قدر کارگر نہ ہو پاتا۔ وزیر خانم کے توسط سے ناول نگار کے لیے اس عہد کی تہذیبی زندگی کے سبھی عُقدوں کو کھولنا آسان تھا اور اس کے ذریعے سے اس عہد کے ادب، ثقافت، مصوّری، رسم و رواج، طرزِ حیات اور سیاسی کشمکش کا مبنی بر حقیقت بلکہ تحقیقی حقائق سے مملو مرقع کھینچنا ممکن۔ تحقیقی صداقتوں کو کام میں لا کر، تخلیقی کام کی وقعت کو اس درجہ بُلند کرنے کی یہ ناول شاید پہلی مثال ہے۔ تحقیق اور تخلیق کے تال میل سے کسی عہد کے تہذیبی مرقعے کو اس قدر لطیف اور خوش آنے والے اسلوب میں کھینچنا اور اس کے ذریعے، اس عہد کی معاشرت کے ظاہر و باطن کو زندہ کر دکھانا شاید شمس الرحمٰن فاروقی ہی کے بس کی بات تھی۔ اس نے اس ناول کے ذریعے اپنی صلاحیت کا بھرپور ثبوت ہی نہیں دیا، اردو ناول کے معیار اور مرتبے کو بھی کئی درجہ آگے بڑھایا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کے افسانوی مجموعے ''سوار'' کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے گمان گزرا تھا کہ شاید وہ نواب میرزا داغ کی داستانِ حیات سے متعلق بھی کوئی افسانہ رقم کریں مگر ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' جیسے بے مثل اور ضخیم ناول کی توقع مجھے بہر طور نہیں تھی۔ پھر میں یہ گمان بھی نہیں رکھتا تھا کہ وہ داغ کی نہیں، بلکہ اس کی والدہ کی داستانِ حیات کو بیان کرنے میں دلچسپی لیں گے۔ اردو ادب سے قدرے گہری رغبت رکھنے والے ہر شخص کو بوجوہ وزیر خانم کے کردار کے بارے میں تفصیل سے جاننے کی تمنا تو یقیناً رہی ہوگی مگر اس کے کھوج میں نکل جانے اور اسے ایک بڑے ناول کی بنیاد بنانے کا خیال شمس الرحمٰن

فاروقی کے سوا کسی اور کو کا ہے آیا ہوگا۔ کیونکہ اس ناول کا مرکزی کردار بظاہر ان ممنوعات میں سے جن کی طرف بڑھنا یا جن کی طرف پلٹ کر دیکھنا بھی مستحسن خیال نہیں کیا جاتا ہوگا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس طرف نگاہ کی تو مجھے گمان تھا کہ وہ قصے کی صداقت کو اپنی بے مثل افسانہ طرازی کے باعث اس قدر بدل کر رکھ دیں گے کہ داغ کی زندگی کا سب سے بڑا داغ دھل جائے گا اور مستقبل کا ادبی مورخ، داغ کی سوانحِ حیات کے حوالے سے شمس الرحمٰن فاروقی کے بیان ہی کو بھروسے کے لائق جانے گا۔ اور ایسا بھروسہ تو یقیناً اب بھی کیا جائے گا کہ تحقیقی اعتبار سے شمس الرحمٰن فاروقی نے کہیں ٹھوکر نہیں کھائی۔ ہاں! اس نے داغ کی زندگی کے داغ کو دھونے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے کہ ناول کی حد تک اسے نواب میرزا داغ اور نواب میرزا داغ کی قسمت کے داغ دھونے سے نہیں، وزیر خانم کی زندگی اور ذات سے دلچسپی رہی ہے اور وزیر خانم سے متعلق ہر شخص اور ہر واقعے میں۔

مارسٹن بلیک، نواب شمس الدین احمد خاں، مرزا تراب علی اور میرزا فخرو، وزیر خانم کی زندگی میں آنے والے اور اپنا نقش جما کر جلد ہی دائمی رُخصت پکڑنے والے چار مرد ہیں۔ وہ پہلے دو مردوں کی داشتہ تھی اور بعد کے دو مردوں کی منکوحہ۔ اپنی اپنی جگہ پر ان چاروں نے اس کی زندگی کی شبِ تاریک کو منور کرنے کی کوشش ضرور کی مگر فرشتہ اجل کے ہاتھوں جگنو کی طرح ٹمٹما کر رہ گئے اور وزیر خانم اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور بے مثال حُسن کے باوجود عمر بھر ان کی یاد میں ماتم کناں رہنے پر مجبور رہی۔ وہ ان چاروں سے کسی نہ کسی سطح پر محبت میں مبتلا محسوس ہوتی ہے اور اس میں کچھ ہرج نہیں کہ قسمت کے دیے داغ دُھل نہ پانے کے باوجود وقت گزرنے اور کبھی حال کی مسرت یا آسودگی کی اوٹ میں ہو جانے پر مدھم ضرور ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ وزیر خانم کی زندگی میں بھی ہوا اور اس کی ذاتی زندگی کے تناظر میں اسے مقدر کے لکھے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ مگر وزیر خانم کی زندگی میں آنے والے چاروں مرد صرف چار مرد ہی نہیں، اپنے عہد کے چار اہم طبقوں کی نمائندگی بھی کرتے تھے۔ مارسٹن بلیک ایسٹ انڈیا کمپنی کے طرزِ حیات اور دبدبے کی نمائندگی کرتے ہیں تو نواب شمس الدین احمد خاں محدود ہوتے ہوئے خود اختیاری کے حلقے میں آزادی کے لیے پھڑ پھڑاتے ہندوستانی نوابوں کی، جب کہ مرزا تراب علی عام ہندوستانی اشرافیہ کے نمائندہ ہیں اور مرزا غلام فخرو بہادر ولی عہد سوم مملکت ہندوستان، قلعہ معلیٰ تک محدود مگر ماضی کی روایات اور شکوہ سے لبریز مگر سکڑتی ہوئی مغل مطلق العنانی کے۔ یہ ایک نئے نظام سلطنت اور نئے بدیسی آقاؤں کے وجود میں آنے کا زمانہ ہے۔ وزیر خانم کی پیدائش سے مرزا فخرو کی وفات تک یہ سارا عرصہ لگ بھگ چالیس برس کا ہے اور یہی چالیس برس ہندوستان کی تاریخ کے بھی اہم ترین چالیس برس ہیں۔ کہ اس عرصے میں ہندوستان کی تاریخ ایک نئی کروٹ لے کر پچھلے سو برس کی سست رو تبدیلی پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کو ہے اور اگلے نوے برس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالنے پر تیار۔ تہذیبی تصادم کی اس سے بہتر اور واضح مثال تو خیر کہیں اور کیا ہوگی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے جس چابک دستی اور ہُنر مندی سے اس تصادم کو متشکل کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر

نادر اور بے مثل ہے۔ظاہر ہے واقعاتی صداقتوں سے اعتنار کھنے والے فکشن نگار کو اس میدان میں خیال کے گھوڑے دوڑانے کی سہولت میسر نہیں۔اس کے باوجود اس نے اپنے کرداروں کی زندگی سے جڑے حقائق کی پیشکش میں اس درجہ تخلیقی سرشاری سے کام لیا ہے کہ اسے بلا تکلف اردو کے کسی بھی عظیم شہ پارے کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے اور فاروقی کو اس ضمن میں کسی نوع کی کسرِ نفسی سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔

''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کا پلاٹ تو گٹھا ہوا اور چُست ہے ہی۔تکنیک کے لحاظ سے بھی یہ ناول ایک پُر لطف تجربے کی حیثیت رکھتا ہے۔ناول کے کچھ ابتدائی ابواب کسی تحقیقی دریافت کی سی شان رکھتے ہیں، جس پر کہیں کہیں رپورتاژ کا رنگ غالب ہے۔پھر کچھ ابواب میں ڈرامائی کیفیت پیش آتی ہے اور تحیر کی معراج کو چھوتی اور قاری کو حواس باختہ کرتی ہوئی ناول کے مستقل مزاج اور یکساں رفتار سے بہنے والے قصے میں ضم ہو جاتی ہے۔جیسے کسی کو جاڑے کا بخار چڑھ آیا ہو اور بعد میں کئی ہفتوں تک ہلکی حرارت کا سلسلہ باقی رہے۔وزیر خانم کے کردار کی کیمیا کو جاننے کے لیے فاروقی نے اس ناول کے کئی ابواب میں سیمیا کی سی نمود کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔کاٹھیاواڑ، پنجاب اور کشمیر سے متعلق ابواب اردو فکشن میں زبان و بیان، جزئیات نگاری اور اسلوب کی ندرت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔اس کے باوصف کہ ان ابواب میں بھی تحقیقی صداقتیں اپنی تمام تر توانائی کے ساتھ برقرار ہیں اور حقائق کے لحاظ سے کسی طرح کی لغزش کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا۔

اُردو میں جو اچھے ناول آج تک لکھے گئے ہیں۔ان میں زبان و بیان کے لحاظ سے ہمواری کم کم ہی پائی جاتی ہے۔مثلاً ''آگ کا دریا'' کے پہلے دو سو صفحات اور ''باگھ'' کے پولیس کلچر سے متعلق پچاس صفحات باقی ناول پر فوقیت رکھتے ہیں مگر ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' میں اس نوع کی ناہمواری سے سابقہ نہیں پڑتا۔شمس الرحمٰن فاروقی نے ناول کے آغاز میں زبان و بیان کی جو سطح قائم کی ہے۔اسے ناول کے آخر تک برقرار رکھا ہے۔پھر بھی ناول کے بعض حصے کلاسیکی معیار کی رفعت کو پہنچ کر اپنی جگہ پر بے مثل اور یادگار بن گئے ہیں اور عموماً یہ حصے ناول کے وہ اجزاء ہیں، جہاں جہاں قصے میں کلائمکس کی صورت پیدا ہوئی ہے اور مصنف کی زبان و بیان پر قدرت اور اس کے حسن بیان کی آزمائش کا وقت آیا ہے۔مرے نزدیک ''مہاراول، مہاواجی سندھیا، لاہور، بنی ٹھنی، میرزا غالب، گردشِ خامہ نقاش، حبیب النسا، راحت افزا، وسواس، مارامیانِ بادیہ باراں گرفتہ است، طالبِ عیش اندا ماجانب غم می روند، زخمی سانپ، کسی، مہا کالی، شوکت محل اور صاحبِ عالم و عالمیان'' کے عنوانات کے تحت درج ہونے والے ابواب اس ناول میں اور اردو ناول کی تاریخ میں بھی یادگار قرار پائیں گے کہ ان میں زبان و بیان کی جن نزاکتوں سے کام لیا ہے اور قصہ گوئی کا جو معیار قائم کیا گیا ہے۔وہ اس سے پہلے کے اردو ناولوں میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' اگرچہ تاریخی ناول نہیں مگر اس میں کچھ شُبہ نہیں کہ اس ناول کے سبھی کردار حقیقی ہیں۔مگر کیا وہ اپنے اصل میں بھی ویسے ہی تھے، جیسا کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے انہیں دکھایا

ہے۔ظاہر ہے فاروقی کی ذاتی تحقیق اور حد درجہ احتیاط کے باوجود اس امر کے حوالے سے تحقیق کا دروازہ کھلا ہے اور ممکن ہے کل کلاں کوئی محقق ان کرداروں کی ذات یا ان سے جُڑے واقعات میں کوئی رخنہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائے مگر شمس الرحمٰن فاروقی نے انہیں جیسے اور جس طرح پیش کیا ہے۔اب میرے لئے انہیں اس کے سوا کسی اور صورت میں قبول کرنا شاید کبھی ممکن نہ ہو سکے۔تحقیقی صداقتوں کی موجودگی سے قطع نظر یہ کردار اب سراسر افسانوی ہیں، کہ فاروقی نے انہیں اپنے کمال کی جادوئی چھڑی سے چھو کر اس درجہ دلکش اور محبوب بنا دیا ہے کہ اس ناول کے کسی بھی قاری کے لیے انہیں کسی اور روپ میں دیکھنا اور ان کی ذات سے جڑی محبت سے دستبردار ہونا ممکن نہیں رہا۔اس ناول میں کھینچے گئے تہذیبی مرقعے اسی نوعیت کے کرداروں کا تقاضا کرتے ہیں۔فرض محال یہ کردار کسی طرح اس کے سوا کوئی اور سطح اور صورت رکھتے بھی ہوں تو بھی ان کی موجودہ صورت سے نظر پھیرنا ممکن نہیں کیوں کہ فاروقی نے ان کرداروں کو پینٹ کرنے میں مبالغے کی جو سطح قائم کی ہے۔اس کے اسلوب کے سحر اور ندرت کی بدولت اب وہ اس تہذیبی مرقعے کا حصہ بن گئی ہے۔جس سے کم تر سطح پر اترنے کی اب ان کرداروں سے توقع بھی نہیں کی جا سکتی۔تاریخ اور افسانے کا اس سے بہتر تال میل اس سے پہلے اردو کے کسی ناول میں دکھائی نہیں دیتا۔

کیا ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' جیسے ناول کو لکھنا آسان اور کیا تاریخی حقائق اور کرداروں کو بنیاد بنا کر قصہ گوئی اختیار کرنا سہل ہے؟ اس ناول کے تناظر میں اس سوال کا جواب ''نہیں'' ہے۔اس لیے کہ ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' میں صرف تاریخی صداقتیں بیان نہیں ہوئیں، ایک خاص عہد، ایک خاص طرح کے تہذیب و تمدن کے خاکستر سے کشید کر کے دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کا کام کسی بھی دوسرے ناول نگار کے مقابلے میں مشکل تھا کہ اسے اپنے تخیل کی رنگینی سے ایک نئی دنیا ایجاد کرنے کے بجائے، ایک مردہ، خواب و خیال ہوئی دنیا میں از سرِ نو روح پھونکنا تھی۔اس طرح کہ وہ اپنے تمام تر لوازمات، جزئیات اور اختصاص کے ساتھ سانس لیتی دکھائی دے۔یہ کام یقیناً مشکل تھا مگر مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ مشکل کام بآسانی اور بخوبی ممکن کر دکھایا ہے۔

اس وقت میرے پیشِ نظر اس ناول کا تجزیاتی مطالعہ کرنا نہیں۔شاید میں اس نوع کی کڑی مشقت کھینچنے کا اہل بھی نہیں۔تاہم ایک معمولی فروگذاشت کی طرف اشارہ کرنا بہت ضروری ہے۔ناول کے صفحہ ۱۴۴ میں داؤد کو پانی پلانے کا محل جیہ کا تھا مگر یہاں جیہ کو جمیلہ سے بدل دیا ہے اور اس سے داؤد اور جیہ اور یعقوب اور جمیلہ کے ''جوڑے'' بدلنے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے۔اگلے ایڈیشن میں کمپوزنگ کی بے محابا اغلاط کے ساتھ اگر اس صفحے کے نسائی کرداروں کے نام بھی آپس میں بدل دیئے جائیں تو ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' کے چہرے کا یہ معمولی سا داغ بھی جاتا رہے گا۔یوں بھی اس نوع کی فروگذاشتیں اور نسیان صرف اور صرف انیس ناگی ہی کے ناولوں میں اچھا لگتا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر مزمل حسین

ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوں کا لسانیاتی مطالعہ

ڈاکٹر انوار احمد کی بطور نقاد اور کہانی کار کی حیثیت ہر اعتبار سے مسلّم ہے، وہ بطور خاص اُردو افسانے کی تنقید اور اُردو افسانے کی تخلیق کے حوالے سے جدید اُردو ادب میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے تنقید کے ساتھ ساتھ اُردو کہانی کی تخلیق میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ اُنہوں نے اُردو اور سرائیکی میں کئی ڈرامے اور افسانے لکھے ہیں۔ چونکہ وہ اُردو افسانے کی تحقیق و تنقید میں تخصیصی اور امتیازی مقام رکھتے ہیں اور اس حوالے سے وہ افسانوی تنقید کا ایک سنجھلا ہوا اور گہرا شعور رکھتے ہیں اس لیے اُن کی کہانیاں افسانے کے فن سے ہر پہلو سے مزیّن ہوتی ہیں۔

تخلیقی ادب میں افسانے کا فن سب سے مشکل اور باریکی سے مملو ہوتا ہے کیونکہ یہ وہ صنف ہے جس میں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کو مکمل جزئیات کے ساتھ اِس طرح بیان کرنا ہوتا ہے کہ قاری اسے ایک ہی نشست میں پڑھ سکے۔ اس لیے اسے شارٹ سٹوری یا مختصر افسانے کا نام بھی دیا ہے۔ یعنی جس طرح غزل میں رمز و ایما سے کام لے کر بڑی سے بڑی بات کو مختصر ترین الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے اسی طرح افسانے میں بھی ایمائی اور رمزیہ کیفیت پیدا کر کے زندگی کی کسی حقیقت کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس مہارت کے لیے ایک گہرے فنی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کی تائید عابد علی عابد کے الفاظ میں اِس طرح سے ہو سکتی ہے:

> ''مختصر افسانے میں بھی غزل کی طرح رمز و ایما کا کھیل بڑی خوب صورتی سے کھیلا جا سکتا ہے۔ اس فن کے دائرے میں بھی اجمال سے تفصیل تراوش کرتی ہے اور ابہام پر توضیح تصدق ہوتی ہے۔ اس فن میں یہی مطلوبہ تاثر اور فضا پیدا کرنے کے لیے افسانہ نگار کبھی دو تین آڑے ترچھے خطوط لگا کر پوری تصویر بنا دیتا ہے، کبھی ایسی مینا کاری کرتا ہے کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔''(۱)

جس طرح زیورات میں نگوں کو جڑ کر سنار اُن کے حُسن میں اضافہ کرتا ہے اسی طرح تخلیق کار کو اگر اپنے فن پر دسترس حاصل ہو تو وہ بھی لفظوں کے حُسن انتخاب سے اپنی تخلیق کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ اس تفصیل کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوں کا لسانیاتی فن ہی اُن کے فنی کمال کا ثبوت ہے۔ وہ انتہائی قلیل الفاظ میں زندگی کی بڑی حقیقتوں کو بیان کرنے کا فن جانتے ہیں۔ اس حوالے سے اُن کے چند افسانوں کے ابتدائیے اور اختتامیے دیکھئے:

> ''میں بھاگ کر اس رکشے میں اس لیے سوار ہوا تھا کہ بچی کھچی خوشبو تو سمیٹ سکوں۔''

(ابتدائیہ، نوں جی)

> ''بے ساختہ میرے منہ سے نکلا ''لعنت ہو تم پر خدا کی'' وہ کہنے لگا۔ ''باؤ جی! میرے گھر کھانے والے نوں جی ہیں۔''(اختتامیہ، نوں جی)

> ''دن بھر کے شور میں اُس کی چپ کچھ عجیب سی لگتی تھی۔''(ابتدائیہ، ایک بے ضرر کہانی)

> ''دن بھر کے شور میں اُس کی چپ کچھ عجیب سی لگتی تھی حالاں کہ صبح ہوتے ہی ہر گھر میں جیسے سوئے فتنے جاگ اُٹھتے۔ بیویوں کو یاد آتا کہ ان کے شوہر رات گئے دیوار پھاند کر گھر آئے تھے۔ شوہروں پر یہ حقیقت عیاں ہوتی کہ انہیں دفتروں سے دیر ہو رہی ہے۔ سکول جانے والے بچوں کو یاد آتا کہ انہیں آج اس کتاب سے سبق یاد کر کے جانا تھا جو پھٹی ہوئی ہے یا گم ہو چکی ہے۔ بوڑھے یہ دیکھ کر افسردہ ہوتے کہ آج بھی دنیا میں قیامت نہیں آئی، اس پر وہ بے طرح کھانستے اور علمِ نجوم پر بلغم پھینکتے۔''(اختتامیہ، ایک بے ضرر کہانی) (۲)

انوار احمد کے سبھی افسانوں کا یہ امتیازی نشان ہے کہ اُن کے افسانوں کا آغاز ڈرامائی اور قاری کو اپنی گرفت میں لینے والا ہوتا ہے اور اختتام چونکا دینے والا اور اِس انداز کے لیے وہ بڑی منفرد زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ ایسی زبان جو افسانے کے مجموعی مزاج سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

انوار احمد اپنے افسانوں کے عنوانات بھی منفرد منتخب کرتے ہیں اور یہ عنوان افسانے کے موضوع کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ مثلاً چند افسانوں کے عنوانات دیکھئے: نوں جی، چرم ہائے قربانی، گونگی غراہٹ، درداں دی ماری دلڑی علیل اے، بچھوؤں کے ساتھ رات، محبت کی سیکنڈ ہینڈ کہانی، پہلے سے سنی ہوئی کہانی، انتظار میں ڈوبا ہوا گھر، بیچ والا آدمی، دُعا کی تلاش، حلفیہ بیان، آخرت ایکسپریس، یرغمالی، وغیرہ۔

انوار احمد کی کہانیوں کے یہ عنوانات علامتی اور اشاراتی ہوتے ہیں اور کہانی کا سارا مفہوم ان کے باطن میں پنہاں ہوتا ہے۔ اسی مفہوم کی جستجو میں قاری کہانی کی بھول بھلیوں میں آگے ہی آگے سفر کرتا ہے کہ اچانک اختتام پر چونک اُٹھتا ہے اور زندگی کی کسی ایسی حقیقت سے آشنا ہو جاتا ہے جس کا سامنا شاید وہ حقیقی زندگی میں نہ کر سکتا ہو۔

انوار احمد مختصر افسانے کو اختصار سے لکھنے کے عادی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مشکل اور ادق زبان اور طوالت، فنی شعور کے فقدان کی علامت ہوتی ہے۔ انوار احمد نے اس مقولے کو سچ کر دکھایا ہے کہ ان کے ہاں فنی شعور کی بے پایاں دولت ہے اسی لیے ان کی کہانیوں کی زبان سادہ اور عام فہم ہوتی ہے اور ان میں بے جا طوالت سے بھی ہر ممکن گریز کیا گیا ہوتا ہے۔ ان کی اکثر کہانیاں تین سے پانچ صفحات پر مشتمل ہوتی ہیں اور اُن میں لفظوں کا حسین انتخاب ایک مربوط، منظّم اور متوازن جملوں میں اس طرح کیا جاتا ہے کہ کہانی کا مجموعی تاثر آغاز سے اختتام تک قائم رہتا ہے۔

انوار احمد کے افسانوں کی زبان ہمیشہ بلیغ اور فصیح ہوتی ہے یعنی ان کی زبان مقتضائے حال ہوتی ہے۔ کہتے ہیں بات میں بلاغت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب مطابقت الفاظ و معانی کا مسئلہ طے ہو جائے اور تخلیق کار اپنے اظہار کے سلسلے میں اس بنیادی نکتے کو مدنظر رکھے کہ اسے آسان ترین انداز میں قاری کے ذہن سے رابطہ قائم کرنا ہے اور یہ رابطہ اس طرح قائم ہو کہ پڑھنے والا محسوس کرے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ برمحل، مناسب اور موزوں ہے (۳)۔ بقول عابد علی عابد:

> ''ناولوں، افسانوں اور ڈراموں میں مطابقت الفاظ و معانی کا مرحلہ طے ہو جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کردار نگاری میں اور مختلف افراد قصہ کے تشخص میں کن چیزوں کا لحاظ رکھا جائے؟ بلیغ انشا پرداز اور فنکار ہمیشہ اپنے معانی کے ابلاغ کے سلسلے میں اپنے کرداروں سے وہ باتیں کروائے گا جو انہیں زیب دیتی ہیں۔ اسے انگریزی میں "Speaking in Character" کہتے ہیں۔'' (۴)

یہ کہانی کار کے سماجی اور لسانی شعور کی بڑی دلیل ہوتی ہے کہ وہ اپنے کرداروں سے اُن کے سماجی رتبے کے مطابق مکالمے ادا کروائے۔ عابد علی عابد نے اس حوالے سے منٹو کی بلیغ و فصیح زبان کے بارے میں کہا ہے کہ منٹو کے کردار اپنی زبان کی وجہ سے الگ سے پہچانے جاتے ہیں اگر منٹو کا کوچوان اپنے عشق کی بات بھی کرے تو بیڑیوں کے گھٹیا تمباکو کی خوشبو یا بساندھ بھی اس کے الفاظ میں رچی ہوئی معلوم ہوتی ہے (۵)۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر انوار احمد کے افسانوں کے کردار اپنی مکالماتی زبان کے حوالے سے اپنی امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں اس پس منظر میں چند کرداروں کی زبان دیکھئے:

رکشہ ڈرائیور: بادشاہو، ہمیں کیا پتا کہ کوئی کون ہے؟ (نوں جی)

کینٹین ملازم: (اپنی تیسری اور چوتھی انگلی میں سگریٹ پھنسا کے کینٹین کے ملازم نے زوردار کش لیا اور کہنے لگا) میں ایک سنمے پر گیٹ کیپر تھا اور اس سے پہلے فلم کے چلتے پھرتے بورڈ کے آگے ٹلی بجاتا تھا۔ علی پور سے حقو حرامی آیا اُس نے مجھے چرس لگائی، پر قسم اے پیر بہار الحق کی جب تک ماں سلامت رہی گھر برابر خرچہ بھیجا، اک دن سنمے پر چھاپہ لگا، جھوٹ نئیں بولتا۔'' (کہانی لکھنے والا)

ڈاکٹر رازی: ناظرین! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم نے ایک طویل جدوجہد کے بعد، آگ اور خون کا دریا عبور کرنے کے بعد یہ ملک حاصل کیا تھا اور یہ ملک ____'' (درداں دی ماری دلڑی علیل اے)

گاڑی میں ایک بزرگ مسافر: ابے سالے، ہمیں بتاتا ہے مرنے کے بعد کیا ہوگا، ماں کے خصم نہیں جانتا یہ ڈبہ قربانی دینے والوں کے لیے ریزرو ہے؟ تو ہمیں! عمر بھر قربانیاں دینے والوں کو بتاتا ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟

حرامی الدھر ہم زندہ کب تھے؟ (آخرت ایکسپریس) (۶)

آخرت ایکسپریس کی یہ ابتدائی لائنیں ہیں ان لائنوں کے ایک ایک لفظ میں طنز کے ایسے نشتر ہیں کہ آغاز ہی سے پورے افسانے کے موضوع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انوار احمد کے افسانوں کا یہ کمال ان کی انہی لفظیات میں پوشیدہ ہے۔

شیکسپیئر کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ ناموں میں کیا رکھا ہے لیکن انوار احمد کے کرداروں کے نام ان کے سماجی مرتبے اور مقام کے غماز ہیں اور یہ نام بطور خاص سرائیکی وسیب کے پس منظر میں سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ناموں میں بہت کچھ رکھا ہے کیونکہ انہی ناموں کی بدولت قاری سرائیکی وسیب کے لوگوں کے دُکھ سکھ، سماجی رتبے، ان کی نفسیاتی کیفیات اور ان سے پیدا ہونے والی الجھنیں سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔ مثلاً فقیر دین، ناسز اخان، سزاوار خان، بھائی قادر، لالہ مراد بخش اور حاجی خواجہ وغیرہ ایسے کردار ہیں جو اپنے ناموں ہی سے اپنی اپنی حیثیت واضح کرتے ہیں۔

انوار احمد نے کہیں کہیں سوال و جواب سے کام لے کر افسانے کو مکالمے کے قریب کر دیا ہے یہاں پر بھی ان کے لسانی شعور نے خاص کام دکھایا ہے کیونکہ اس طرح اُنہوں نے اپنے موقف کو بہتر طور پر بیان کیا ہے۔

انوار احمد کے زیادہ تر افسانے ملک کے بدترین مارشل لا کے دَور میں تخلیق ہوئے ہیں۔ یہ وہ دَور تھا جب حق سچ کے اظہار پر ناروا پابندیاں تھیں، انسانیت غلیظ بوٹوں تلے سسک رہی تھی لیکن سچ سچ ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح اپنا اظہار کرتا رہتا تھا۔ لہٰذا اس موسم بے اعتبار میں ادب کی تخلیق بیانیہ کی بجائے علامتی ہوتی ہے۔ انوار احمد کے افسانے بھی اسی تناظر میں تخلیق ہوئے ہیں۔ آپ نے طرح طرح کی علامتیں اور اشارے استعمال کر کے اپنے افسانوں کو ایمائی اور رمزیہ حُسن عطا کیا ہے ہم نے گفتگو کے آغاز میں لکھا تھا کہ افسانے کا ایک پہلو غزل کی طرح ایمائی اور رمزیہ ہوتا ہے اور یہی افسانے کا حُسن ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ افسانے اور عورت میں اُسی وقت حُسن قائم رہتا ہے جب وہ کچھ دکھائے اور کچھ چھپائے۔ انوار احمد کے افسانے اسی وصف سے مملو ہیں اور علامتی و اشاراتی زبان کی اعلیٰ مثال ہیں۔

اخذ و استفادہ

۱۔ عابد علی عابد، پروفیسر، ''اصول انتقادِ ادبیات'' (لاہور: سنگ میل، ۱۹۹۷ء)

۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''پہلے سے سنی ہوئی کہانی'' (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۰۳ء)

۳۔ ایضاً

۴۔ اصول انتقادِ ادبیات ۵۔ ایضاً

۶۔ پہلے سے سنی ہوئی کہانی۔

☆☆☆

عابد میر

ادب، سیاست اور تحریک

یہ المیہ صرف ادبی نہیں بلکہ مجموعی سطح پر انسانی تاریخ کا المیہ رہا ہے کہ جب تک انسان نے غاروں کی انفرادی زندگی سے نکل کر قدیم اشتراکی عہد میں قدم نہیں رکھا وہ تہذیب اور ارتقاء کے مراحل طے نہیں کر سکا کیونکہ جدوجہد تحریک مانگی ہے اور تحریک اجتماعیت سے فروغ پاتی ہے۔ سو انسان ذات کے معبد سے نکل کر جُوں جُوں اجتماعی بنتا گیا اُس نے صرف گھر کے مسائل چھوڑ کر نسلِ انسانی کے مشترکہ مسائل اور ان کے حل پر سوچنا شروع کیا تو اس برق رفتاری سے ارتقاء اور ترقی کے مراحل طے کیے کہ خود اُس کے اِردگرد کا انسان کہہ اُٹھا ''محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی؟''

یہ اجتماعی انسانی فکر ہی کا نتیجہ تھا کہ دُنیا نے انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس جیسے معرکے فتح ہوتے ہوئے دیکھے۔ ان عوامی انقلابات کی فتح یابی میں کلیدی دستہ ادب ہی کا رہا اس لئے آج بھی جب ادب عالیہ کی بات آتی ہے تو فرانسیسی اور رُوسی ادب کے سامنے دُنیا بھر کا عالمی ادب ہیچ نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف رُوسی انقلاب کے رہنما لینن کو جہاں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اگر ادیبوں کی فکری مدد ہمیں میسر نہ ہوتی تو شاید انقلاب کا پُر پیچ راستہ ہم اس قدر جلد طے نہ کر پاتے تو دُوسری طرف شہنشاہِ فرانس سارتر جیسے ادیب کو ناپسندیدگی کے باوجود جلاوطنی کا حکم نہیں دے سکتا کیونکہ وہ اسے فرانس کے عوام کا دماغ سمجھتا ہے۔ برِصغیر میں اُردو کے ادبِ عالیہ ہی کو دیکھ لیں میرؔ و سوداؔ کا عہد اگر اُردو شاعری کا عہدِ زریں ہے تو غالبؔ، ذوقؔ اور داغؔ اُردو شاعری کے ماتھے کا جُھومر ہیں گو کہ ۱۹۳۰ء کی دہائی سے قبل برِصغیر کے ادب میں تحریک کی روایت نہیں رہی لیکن قدیم شعراء کے ذہنی و فکری تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں انہیں دبستانِ لکھنؤ اور دبستانِ دلی کے خانوں میں رکھ کر دیکھنا پڑتا ہے یہ دبستان تحریک ہی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہاں سے برِصغیر کا ادب ایک نئی کروٹ لیتا ہے۔ گویا مردہ بدن میں جان پڑتی ہے پہلی بار ادب دربار اور کوٹھوں سے نکل کر عوام کے درمیان آیا۔ عوام نے نہ صرف ادب کو سر آنکھوں پر بٹھایا بلکہ ان کے دُکھ درد پر مرہم رکھنے والے مسیحاؤں کو انہوں نے خُوب پذیرائی بخشی۔ مارشل لاء کی آمریت سے لے کر ون یُونٹ کی سختیوں تک کے عذاب حساس ادیبوں نے اپنے بدن پہ کوڑوں کی صورت میں سہہ کر بھی عوام کے حق میں نغمے گائے۔ ادب نے ایک قافلے کی صُورت اختیار کی تو صاحبانِ اقتدار کی نظروں میں انقلابِ فرانس اور انقلابِ رُوس کا نقشہ گھُوم گیا اور اس سے قبل کہ یہ قافلہ عوامی انقلاب کی جانب پیش قدمی کرتا اقتداری قوتوں نے اپنے سابقہ ناکام تجربوں کی بنیاد پر یہ جان لیا کہ کسی بھی نوعیت کی سختیاں

انہیں ڈرا دھمکا نہیں سکتیں بلکہ ان کے حوصلوں کو مزید پُختہ کر دیتی ہیں، ان کا جوش اور عزم مزید بلند ہو جاتا ہے۔ یہ تو بازار میں پابجولاں چلنے والے لوگ ہیں البتہ یہ فاقہ کش ہیں، بھوکے ننگے ہیں، ان میں کچھ اسٹیٹس کے مارے ہوئے بھی ہیں (کہ بھوک سے بڑھ کر کوئی انسان کا دُشمن نہیں ہوتا)۔

سو اب تحریکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر سرکاری اداروں کی صورت اختیار کر گئیں۔ جیل کی کال کوٹھڑی میں عوام سے ہمدردی کے بدلے عذاب سہنے والے ادیب کو وائٹ کالر بنا کر بڑے بڑے عہدوں پر بٹھا دیا گیا۔ تحریکیں پہلے ''حلقوں'' میں ضم ہوئیں پھر ''کیفے'' کی ٹیبلوں تک آئیں اور آخر ''ڈرائنگ روموں'' کے اجلاس تک محدود ہو کر رہ گئیں۔ ظلم تو اس نسل کے ساتھ ہوا جو اس عہد میں شعور کی سطح کو پہنچی جب اُس کے پاس دیکھنے کے لیے کوئی مشترکہ خواب بھی نہیں رہا۔ اب چاہے ورلڈ ٹریڈ سینٹر ہزاروں انسانوں کے اُوپر آ گرے یا سونامی سینکڑوں انسانوں کی مُسرتیں بہا کر لے جائے، بنیاد پرستی کا جن انسانیت کو نگلتا رہے، خواہ سرمایہ داری ڈبلیو ٹی او کے خوفناک عوام دُشمن اژدہے کی صورت اختیار کر لے، ادیب کو اس سے کوئی غرض ہے نہ ادب کو۔ کیونکہ جدید عہد میں فلسفہ اور تاریخ کی طرح ادب اور سیاست کے دھارے بھی الگ ہو چکے ہیں۔ تمام عوامی مسائل سیاسی مسائل ہیں، ان پر بات کرنے سے ادیب بھی ''سیاسی'' ہو جاتا ہے جو موجودہ عہد میں کسی جُرم سے کم نہیں۔ پُرتعیش زندگی کے عادی ہو جانے والے ''ادارہ جاتی'' وائیٹ کالر ادیبوں نے نئی نسل کو یہ سکھایا کہ ہمارے چیخنے چلانے سے، فریاد کرنے سے اور لکھنے سے نہ تو سرکار پر کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ عوام پر اس لیے آپ اطمینان سے اپنے حصے کا کام کرتے جائیں۔ بھاڑ میں گئی سیاست اور بھاڑ میں گئے عوام!

ان خیالات کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والی نئی نسل جو پہلے ۱۵ انچ کے ڈبے میں قید ہوئی اور اب یہ انفرادیت ۱۵ انچ کے ڈبے تک آ پہنچا ہے۔ اس نسل کو دیکھنے کے لیے ایک ہی خواب ملا کہ محبوب کے ہاتھ کا کنگن کیسے بنا جا سکتا ہے۔۔۔ انسانیت سے محبت اب خواب ہوئی۔ انسانیت کے دُکھ درد پہ آنسو بہانے اور اُس کی عظمت کے خواب دیکھنے والے ''سیاسی پاگل پن'' کا شکار کہلائے۔ تاریخ کا کیسا ستم ہے کہ تبدیلی نے ہمیشہ منفی سے مثبت کا سفر کیا ہے لیکن ہماری نسل کو ملنے والی تبدیلی بھی مثبت سے منفی کا سفر ثابت ہو رہی ہے۔ موجودہ نسل کا المیہ نسلِ انسانی کے ابتدائی ارتقائی المیے سے کچھ کم نہیں کہ انسان گروہ سے، ہجوم سے نکل کر ایک بار پھر ذات کے معبد میں قید ہوتا جا رہا ہے۔ انٹرنیٹ چیٹنگ نے انسانی تخیل کی لامحدودیت تو ثابت کر دی لیکن شاعر کا تخیل اتنا محدود ہو چکا ہے کہ اردگرد کی بدحالی اور ظلم و ستم کے اثرات اُسے محسوس نہیں ہوتے۔ سینکڑوں میل دُور بیٹھے دوستوں کا احوال SMS کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن ایک ہی شہر کے دوسرے کونے پر بھوک سے مرتے انسانوں کا احوال معلوم نہیں ہوتا۔ قصور اس ٹیکنالوجی کا نہیں جس نے فاصلوں کو کم کیا ہے قصور ان تخیل پردازوں کا ہے جنہوں نے ٹیکنالوجی کے سامنے اپنے تخیل اور احساس کو ''سرنڈر'' کر دیا ہے اور اس کا سبب انفرادی آسائشوں کے تحفظ کے خوف

کے باعث اجتماعیت سے دُوری ہے کیونکہ جدوجہد تحریک مانگتی ہے اور تحریک اجتماعیت سے فروغ پاتی ہے!

بات صرف اتنی ہے کہ فلسفہ ہو یا تاریخ، ادب ہو یا سیاست، تحریک سماج سے جنم لیتی ہے اور تمام علوم کے دھارے یہیں سے پھُوٹتے ہیں۔ اس لیے ادب اور سیاست کو نہ تو سماج سے الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ ایک دُوسرے سے ___ بلکہ ان دونوں کا الحاق/تعاون ہی تحریک کو جنم دیتا ہے، تحریک ۔۔۔۔ جو انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ حالات اس کے متقاضی ہیں کہ ادب اور سیاست مل کر نئی تحریک کو جنم دیں ورنہ نئی نسل نہ صرف انقلاب کے مفہوم سے نا آشنا رہ جائے گی بلکہ فکری بانجھ پن اس کی رگ رگ میں سرایت کر جائے گا۔!

☆☆☆

نبیل احمد نبیل

اُردو زبان اور جدید تقاضے

''اُردو'' ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی لشکر یا فوج کے ہیں، لیکن لفظ اردو کی ساخت پر بھی بہت سے محققین کی آرا مختلف ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کے نزدیک یہ لفظ ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے یعنی اوراد، اوردہ اور اردو جس کے معنی فرودگاہ، لشکر، لشکر کا حصہ، پڑاؤ وغیرہ۔ علامہ آئی آئی قاضی کے نزدیک اردو ترکی زبان کا لفظ نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عام سندھی بول چال میں ''اردو'' ڈھیر یا اشیا کے ذخیروں اور انسانوں کے اجتماع کو کہتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ''ارڈ'' (Urd) سندھ یا ہند میں پیدا نہیں ہوا۔ اس کی ابتدا ماقبل تاریخ کے معنی میں ہوئی۔ ان کے نزدیک ''دیومالا'' میں لفظ ''ارڈ'' (Urd) یا (Urth) ایک دیوی کا نام ہے۔ یہ لفظ زرتشتیوں کی مقدس کتاب ''اوستا'' میں بھی موجود ہے۔ ''اردبل'' کا شہر اور ''اردشیر'' اس لفظ کے استعمال کے ثبوت ہیں۔ علامہ آئی آئی قاضی کا کہنا ہے کہ لفظ ارد، آریائی تہذیب کا مظہر ہے یہی وہ لفظ ہے جو ''اردو'' کا ماخذ ہے۔ جس کے معنی ایسے مجمع کی زبان ہے، جس میں ہر قسم کے لوگ شامل ہوں۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ اردو لفظ لاطینی الاصل ہے۔ یہ (Herde) سے بنا ہے جس کے معنی ہیں گروہ، مجمع، لشکر، خانہ بدوش۔ ترکی میں یہ لفظ بعد میں پہنچا۔ حکیم شمس اللہ قادری نے کہا ہے کہ چنگیز خان اور اس کی اولاد کے زمانے میں مغل بادشاہوں اور شہزادوں کے فرودگاہوں اور لشکر گاہوں کو اردو کہا کرتے تھے۔ ہندوستان میں لفظ سلاطینِ دہلی کے دور میں مروج ہوا۔ ہندوستان میں لفظ اردو سب سے پہلے بابر نے اپنی تزک میں لشکر کے معنوں میں استعمال کیا۔ حافظ محمود شیرانی کے بقول بابر اپنی ٹکسال کو بھی اردو کہتا تھا۔ مختلف محققین کہتے ہیں کہ لفظ اردو سب سے پہلے ۱۷۸۴ء میں تصنیف شدہ کتاب ''تذکرۂ گلزار ابراہیم'' میں استعمال ہوا۔ حافظ محمود شیرانی کے نزدیک زبان کے معنوں میں لفظ اردو استعمال سب سے پہلے مسٹر گل کرائسٹ نے اپنی انگریزی تالیف ''قواعد زبان'' مطبوعہ ۱۷۹۶ء میں کیا۔ کئی لوگوں نے مختلف اشعار کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ زبان کے معنوں میں اردو کا لفظ ۱۱۷۶ء ہجری (۱۷۶۲ء) سے قبل استعمال ہو چکا تھا۔

اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں تحقیق کا آغاز انگریز اور یورپین محققین نے کیا۔ گارساں دتاسی (فرنچ تھا) ہمیشہ سالانہ لیکچر کراتا تھا جس میں اردو کے حوالے سے بھی لیکچر ہوا کرتے تھے۔ اس لیے پہلا تذکرہ جس میں تاریخ کا لفظ ملتا ہے ''تذکرہ تاریخِ ہندوستانیہ'' ہے۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں ہندوستان سے تعلق رکھنے والے مختلف محققین نے اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنے اپنے نظریات پر

کئی تالیفات پیش کرنا شروع کیں، جن میں نصیرالدین ہاشمی ۱۹۲۳ء میں ''دکن میں اردو'' کے عنوان سے اردو کی ابتدا کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی اور اس کے بعد نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا اور شوکت حسین سبزواری، ڈاکٹر مسعود حسن خان، ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اسی موضوع پر کتابیں لکھیں۔

اردو زبان میں بہت سی زبانوں کے الفاظ موجود ہیں اس لیے یہ ایک مخلوط زبان ہے اور اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق عام طور پر دنیا میں سب سے کثیر تعداد میں بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں چینی اور انگریزی کے بعد تیسری بڑی زبان اردو ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں وہ تمام حروف موجود ہیں جنہیں باقی زبانیں آسانی سے ادا نہیں کر سکتیں۔ یوں تو انگریزی کے بہت سے الفاظ اردو میں شامل ہو کر اس زبان کا حصہ بن چکے ہیں، لیکن پھر بھی اس بڑی زبان میں کچھ ایسے الفاظ ادا کرنے کی صلاحیت موجود نہیں جو اردو میں آسانی سے ادا کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً خ، ذ، ق، بھ، تھ، جھ، وغیرہ۔ اسی طرح فارسی ایک شیریں زبان ہے اور اردو سے پہلے موجود تھی اس کے بھی لاتعداد الفاظ اردو میں آئے اور اسی کے ہو کر رہ گئے، لیکن فارسی والے ٹ، ڈ، ڑ، بھ، تھ، کھ، وغیرہ کی آوازیں ادا کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ عربی بولنے والے بھی پ، ٹ، ڈ، ڑ، چ، کھ، گھ، چھ وغیرہ کی آوازیں ادا نہیں کر سکتے۔ ہندی والے بھی کچھ آوازوں سے محروم ہیں جن میں ع، غ، ف، ق، ک، ذ، ظ، ز، ض، وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام الفاظ جو ان زبانوں میں نہیں اور اردو میں شامل ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو نے یہ الفاظ برِصغیر کی مقامی زبانوں سے لیے ہیں۔

اردو میں بین الاقوامیت پائی جاتی ہے کیوں کہ اس کے حروفِ تہجی کی تعداد دوسری زبانوں کی نسبت زیادہ ہے اور ہر زبان کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پاکستان میں اردو کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ قائدِ ملت لیاقت علی خان مرحوم نے انجمنِ ترقی اردو کراچی کے جلسے میں ۱۹ نومبر ۱۹۴۹ء کو فرمایا:

> ''مجھے کہنے میں باک نہیں کہ اردو اور صرف اردو ہماری قومی زبان ہے اور یہی ایک زبان ہے جو پاکستان کی قومی زبان بننے کی مستحق ہے۔''

حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر مہر عبدالحق، پیر حسام الدین راشدی، ابوظفر ندوی، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اور دیگر محققین اور ماہرِ لسانیات نے اردو کا پہلا گہوارہ وادیِ سندھ اور ملتان کی سرزمین قرار دیا ہے ان تمام محققین کی آرا اپنی جگہ درست، لیکن اردو زبان مخلوط زبان ہے اور یہ مقامی سطح سے نکل کر قومی سطح پر آ چکی ہے اس میں بین الاقوامیت کے گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ ردو قبول کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور رہے گا کیوں کہ اردو میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ مختلف زبانوں کے الفاظ اپنے اندر سمو لیتی ہے۔

اردو ہندوستان و پاکستان کے تمام علاقوں میں باہمی روابط قائم کرنے اور ایک علاقے کو دوسرے علاقے سے قریب تر لانے میں نہایت ہی اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ آپ اردو کو بین الاقوامی سطح پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کی تمام زبانوں میں یہ خصوصیت صرف اردو ہی کو حاصل ہے۔ ہندوستان اور پاکستان سے باہر بھی مختلف ممالک میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے باہمی تعلقات کے علاوہ ان ممالک کے اندرونی و داخلی روابط کو بھی اردو ہی نے استوار کیا ہے۔ ہندوستان و پاکستان دونوں ایک برعظیم کی حیثیت رکھتے ہیں ان دونوں ممالک میں دُور دراز علاقوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے میں اردو ہی مؤثر کردار کرتی ہے۔ ہندوستان و پاکستان کے افراد جب بیرونی ممالک میں ہوتے ہیں اور کسی ہم وطن سے ملتے ہیں تو خواہ وہ کسی علاقے کے رہنے والے ہوں باہمی گفتگو اردو ہی میں کرتے ہیں۔ اس طرح اردو مختلف ممالک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اردو کے بیشتر الفاظ دنیا کے مختلف ممالک میں پہنچ چکے ہیں۔ یہ بارہا کا تجربہ ہے کہ ہمارے ملک میں ممالک اسلامیہ کے مہمان آتے ہیں تو ان میں سے بیشتر افراد اردو کے متعدد الفاظ سے پہلے ہی واقف ہوتے ہیں، چوں کہ اردو میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ بکثرت مستعمل ہیں اس لیے مشرقِ وسطیٰ سے آنے والے افراد کے لیے یہ الفاظ اجنبی اور غیر مانوس نہیں ہوتے۔ الفاظ اور رسم الخط کی مماثلت کی وجہ سے ممالکِ اسلامیہ کا ایک بیشتر حصہ ہمارے ملک سے لسانی طور قریب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یورپ و امریکہ کے جن ممالک میں پاکستان و ہندوستان کے افراد پہنچ چکے ہیں وہاں بھی اردو نے اپنے قدم جما لیے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی سرزمین سے باہر قدم نکالنے کے بعد علاقائی زبانیں اپنا دم توڑ دیتی ہیں اور صرف اردو ہی کا سکہ جاری رہتا ہے۔ پنجابی ہو یا سندھی، بلوچی ہو یا پشتو یہ سب کے سب جب اپنی علاقائی حدود سے باہر نکلتے ہیں تو اپنے آپ کو پاکستانی ہی سمجھتے ہیں اور اردو ہی بولتے ہیں۔ علاقائی بندھن ٹوٹتے ہی ملک کی ہمہ گیر وسعت غالب آ جاتی ہے اور سب کے سب ایک رنگ میں رنگ کر ایک ہی زبان بولتے ہوئے نظر آتے ہیں اور وہ زبان اردو ہی ہوتی ہے۔ جسے بیرونی ممالک میں ''ہندوستانی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لندن کی آبادی کا ایک خاصا حصہ اردو بولنے والوں پر مشتمل ہے۔ اردو کی بین الاقوامی حیثیت کا اندازہ اس سے بھی لگائیے کہ لندن سے اردو کا اخبار آج برسوں سے باقاعدگی کے ساتھ نکل رہا ہے۔ افریقہ کے بیشتر ممالک میں اردو کتابوں کی طباعت اور نشر و اشاعت کے مراکز قائم ہیں۔ اشتراکی ممالک میں روس اور چین دونوں میں اپنے اپنے حدودِ مملکت میں اردو کتب و رسائل کی اشاعت و طباعت کا اہتمام بڑے پیمانے پر کرتے ہیں۔ انڈونیشیا، سنگاپور اور برما وغیرہ میں تو اردو بولنے والے قدم قدم پر ملتے ہیں۔ یہ تمام امور اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اردو ہمہ گیر وسعت کی حامل ہے اور اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی ایک خاص تعداد بیرونی ممالک میں بھی موجود ہے۔

امریکہ نے غیر ملکی زبانوں کے لیے ایک وسیع محکمہ قائم کیا ہے جس میں امریکیوں کے لیے

اردو کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام موجود ہے۔ آپ کو بے شمار امریکی ایسے ملیں گے جو اردو بولنے اور سمجھنے پر پوری طرح قادر ہیں۔ اسی طرح جرمن قوم میں اردو زبان کے ماہرین کی خاصی تعداد رہی ہے۔ مشہور جرمن خاتون ڈاکٹر شمل اردو زبان پر قدرت کاملہ رکھتی تھیں۔ لاہور میں یومِ اقبال کے موقع پر انہوں نے اردو زبان میں تقریر کر کے سامعین کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

اردو کا بنیادی ڈھانچہ اگرچہ مقامی خمیر سے تیار ہوا ہے لیکن یہ اپنی ساخت کے اعتبار سے بین الاقوامی مزاج کی مخلوط زبان ہے۔ اردو ہندی، عربی، فارسی زبانوں اور مقامی بولیوں کے الفاظ اس کثرت سے داخل ہیں کہ ان کا شمار کرنا محال ہے۔ اس کے علاوہ اس میں انگریزی، اطالوی، پرتگالی، ترکی، جرمن، چینی، سکنڈے نیوین، فرانسیسی، ولندیزی، یونانی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ الفاظ روزمرہ کی تحریر و تقریر میں بے کھٹکے بولے جاتے ہیں۔ ان زبانوں کے الفاظ دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ اردو کے لیے ہی بنے ہیں اور اردو میں غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی کس قدر صلاحیت موجود ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی ترقی کی رفتار کے ساتھ زبان میں وسعت ہوتی چلی جا رہی ہے جیسے جیسے دنیا ترقی کرے گی نئی نئی ایجادات ہوں گی اور ان کے نام اردو میں شامل ہوتے رہیں گے۔ انگریزی کے کچھ نام مثلاً کمپیوٹر، آئی ٹی، انٹرنیٹ، ویب سائٹ، موبائل فون، چیٹنگ وغیرہ۔ اس طرح کے بے شمار نام نہ صرف اردو بلکہ پنجابی بولنے والے بھی انہیں اسی طرح ادا کرتے ہیں۔ اس کی وسعت کے کیا کیا امکانات ہیں اکیسویں صدی میں یہ کیا کیا صورتیں اختیار کرے گی اور یہ زبان اتنی ترقی یافتہ ہو جائے گی کہ بقول شاعر

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

☆☆☆

ضیا المصطفیٰ ترک مہروی

جب تک تیرے بدن کا اُجالا نہیں کھلا
بے تاب آئینوں کا تقاضا نہیں کھلا

ہم کم نصیب جان نہ پائے وہ ساعتیں
اک راز ہم پہ کھلنے لگا تھا، نہیں کھلا

دریا کے پار اترنے کا امکان کم ہے آج
اس موجِ تند رَو کا ارادہ نہیں کھلا

جائیں اگر تو جائیں کہاں ہم سفر نژاد
سمتِ سفر کھلی ہے تو رستہ نہیں کھلا

دشتِ جہات و آئینہ، شہر پسِ چراغ
اس چشمِ کم نگاہ پہ کیا کیا نہیں کھلا

اس گل بدن سے ترکِ تعلق کے باوجود
کیونکر میں جی رہا ہوں یہ عُقدہ نہیں کھلا

شاید کسی نے دھوپ کی چادر لپیٹ لی
آج ایک بھی درخت کا سایہ نہیں کھلا

یوں تھے مقیم شہرِ خوش اندیشگاں کے بیچ
برسوں تیرے بچھڑنے کا خدشہ نہیں کھلا

ضیا المصطفیٰ ترک مہروی

خاکداں کی بنا پر جو رکھنے لگا
پہلی ساعت کا دل دھڑکنے لگا

اوّلیں پانیوں پہ پھیلا ہوا
آسماں کچھ پرے سرکنے لگا

جاوداں آگ تھی میرے پیچھے
جب میں آبِ ازل کو چکھنے لگا

اُس نے یکبارگی مجھے دیکھا
اور پھر میں بھی دیکھ سکنے لگا

خاک میں خدّ و خال اُبھرے تو
ہو بہو جیسے میں جھلکنے لگا

میری تکمیل سے ذرا پہلے
دستِ غیبی مجھے تھپکنے لگا

سامنے طاق پر تھیں آنکھیں میری
جب وہ مجھ میں چراغ رکھنے لگا

کہنہ لفظوں میں تُرک بعض اوقات
نیا لہجہ کوئی دمکنے لگا

☆☆☆

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

آئینے کے آخری اظہار میں
میں بھی ہوں شامِ ابد آثار میں

دیکھتے ہی دیکھتے گم ہو گئی
روشنی بڑھتی ہوئی رفتار میں

قطرہ قطرہ چھت سے ہی رِسنے لگی
دھوپ کا رستہ نہ تھا دیوار میں

اپنی آنکھیں ہی میں بھول آیا کہیں
رات - اتنی بھیڑ تھی بازار میں

بار بار آتا رہا ہے تیرا نام
آئینہ ہوتی ہوئی گفتار میں

دُور تک بچھتی چلی جاتی تھی نیند
خواب آتا ہی نہ تھا اظہار میں

☆☆☆

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

ہوش میں ہوں نہ اپنے بس میں ہوں
جانے میں کس کی دسترس میں ہوں

تُو کہ بے کارواں ہے مدت سے
میں کہ آوازۂ جرس میں ہوں

ہاں ابھی میں اسیر ہوں تیرا
ہاں ابھی زیست کے قفس میں ہوں

تجھ سے بھی بڑھ کے ہوں نزاکت میں
نکہتِ گُل ! تیرے نفَس میں ہوں

اپنا اظہار چاہتا ہوں میں
نئے اُسلوب کی ہوَس میں ہوں

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

پہلی پہلی دھوپ کا آغاز تھا
میں جو لوٹا - ہر دریچہ باز تھا

دُور تک بہتا ہوا ہر راستہ
میری خاطر سر بسر آواز تھا

جاگتی آنکھوں کی راحت کے لیے
صبح تک ہر خواب پَس انداز تھا

کہتے ہیں : لَو بولتی بھی تھی کبھی
اگلے وقتوں میں چراغ اِک ساز تھا

اُن دنوں وہ گل بدن ، خوش پیرہن
شاید اپنا محرم و ہم راز تھا

پت جھڑوں کی زد میں تھیں سب ٹہنیاں
ہر پرندہ پیڑ سے ناراض تھا

اس قدر ہم شکل آوازوں کے بیچ
میرا لہجہ ہی میرا غمّاز تھا

دوست جلدی میں تھے سارے اور مجھے
اپنی آہستہ روی پر ناز تھا

☆☆☆

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

یہ میں ہی تھا سامنے کہ تُو تھی
چراغ تھا یا کہ آبِ جُو تھی

شگفت کا وقت مختصر تھا
سکوت کے ساتھ گفتگو تھی

زمین کی آخری روایت
قدیم زماں کی جستجو تھی

سُنا ہے : حصار ٹوٹتے ہی
الاؤ کی آگ چار سُو تھی

شباہتیں محو کرتی شب میں
ثبات کی شاخ بے نمو تھی

ہمارے ہی درمیاں تھی برپا
چہار طرف جو ہاؤ ہُو تھی

ہمی سے تھی ، مہرویؔ توقع
ہماری قبا ہی بے رفو تھی

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

طغیانی سے ڈر جاتا ہوں
جسم کے پار اُتر جاتا ہوں

آوازوں میں بہتے بہتے
خاموشی سے مر جاتا ہوں

نیند ادھوری رہ جاتی ہے
سوتے سوتے ڈر جاتا ہوں

چاہے بعد میں مان بھی جاؤں
پہلی بار مگر جاتا ہوں

تھوڑی سی بارش ہوتی ہے
کتنی جلدی بھر جاتا ہوں

کتنے دنوں کی دہلیزوں سے
رات کے ساتھ گزر جاتا ہوں

☆☆☆

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

جواب کے بارکری، اس سے پیشتر نہیں کی
ہزار شکر کہ یہ صبح جاگ کر نہیں کی

ہمیشہ دل کو رکھا بے خبر تیرے بارے
اوراب کے دل نے ہمیں بھی کوئی خبر نہیں کی

بس ایک خواب کہ ہر شام جاگ اُٹھتا ہے
بس ایک شب کہ جو بیرونِ دَر بسر نہیں کی

معاملت میں ہمیشہ ہی نامراد رہے
اور اِس دفعہ بھی شروعات سوچ کر نہیں کی

بغیر اس کے سبھی گفتگو ہے - لاحاصل
وہ بات جو ہمیں کرنا تو تھی مگر نہیں کی

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

شمع وار اَب کے جلوں بھی کہ نہیں
روبرو تیرے رہوں بھی کہ نہیں

میں کہ موجود سے آزُردہ ہوں
کوئی بتلاؤ ! میں ہوں بھی کہ نہیں

گفتنی ہے کہ یہ ناگفتنی ہے
کیا خبر تجھ سے کہوں بھی کہ نہیں

اندروں تو ہے سراسر خالی
جانے ہوں اپنے بروں بھی کہ نہیں

اتّفاقی ہی نہ ہو - ہونا میرا
بارِ دیگر میں ہوں بھی کہ نہیں

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

وہ ایک رنگ کہ جو بے نیام مجھ سے ہوا
گریز کرتے ہوئے ہم کلام مجھ سے ہوا

وہ ایک قوس کہ جو دائرہ ہوئی مجھ سے
کسی سے ہو نہ سکا تھا جو کام مجھ سے ہوا

پھر ایک صبح وہ آئینہ مجھ سے ٹوٹ گیا
کسے کہوں کہ میرا انہدام مجھ سے ہوا

تمام عمر یہی ایک دن لیے پھرا میں
یہ ایک دن بھی کہاں اختتام مجھ سے ہوا

پھرایک شب نے میرے طاقچے پہ دستک دی
اور اس کے بعد یہ پیکر تمام مجھ سے ہوا

بہت کٹھن تھی تیرے بعد لب کشائی بھی
یہی بہت ہے جو یہ حرفِ خام مجھ سے ہوا

☆☆☆

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

دنوں میں دن تھے، شبوں میں شبیں پڑی ہوئی تھیں
سبھی کہانیاں اِک طاق میں پڑی ہوئی تھیں

اذان گونجی تو محراب میں کوئی بھی نہ تھا
بس ایک رِحل پہ کچھ آیتیں پڑی ہوئی تھیں

سنائی دیتا ہے اب بھی مقدسات کے گرد
وہ لحن جس میں کئی حیرتیں پڑی ہوئی تھیں

مجھے نوازا تو پیشانی پر لکھا اُس نے
وہ نام جس میں سبھی نسبتیں پڑی ہوئی تھیں

چراغ اوندھے پڑے تھے، زمین پر سارے
اوراُن کے پاس میں اُن کی لَویں پڑی ہوئی تھیں

نہ برگ و بار ہی آئے، نہ سائبانی کی
ہماری شاخوں پہ کیسی گرہیں☆ پڑی ہوئی تھیں

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

نہ تھیں تو دُور کہیں دھیان میں پڑی ہوئی تھیں
تمام آیتیں امکان میں پڑی ہوئی تھیں

کواڑ کھلنے سے پہلے ہی دن نکل آیا
بشارتیں ابھی سامان میں پڑی ہوئی تھیں

وہیں شکستہ قدیموں پہ آگ روشن تھی
وہیں روایتیں انجان میں پڑی ہوئی تھیں

ہم اپنے آپ سے بھی ہم سخن نہ ہوتے تھے
کہ ساری مشکلیں آسان میں پڑی ہوئی تھیں

پسِ چراغ میں جو سمتیں ڈھونڈتا رہا تُرکؔ
وہ ایک لفظ کے دوران میں پڑی ہوئی تھیں

☆ یہ تلفظ، دانستہ استعمال کیا گیا ہے۔

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

یہ سب موجود بے معنی، میسّر رائیگاں ہے
مگر اِک خواب ہے اور وہ بھی اکثر رائیگاں ہے

وہ بے سمتی ہے، خود اپنا تعین کرنا ہوگا
ابھی اپنے لیے ہر ایک منظر رائیگاں ہے

ہمارے بیچ جو کچھ تھا، سراسر رائیگاں تھا
ہمارے بیچ جو کچھ ہے، سراسر رائیگاں ہے

محبت ہے تو کوئی نام ہونا چاہیے تھا
سواب کی بار پہلے سے بھی بڑھ کر رائیگاں ہے

سخن کرتا رہے تو آئینہ کافی ہے مجھ کو
دِیا روشن نہ ہو تو طاقچے پر رائیگاں ہے

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

لفظ جب گرد سے اَٹ جاتے ہیں
میری پوروں سے لپٹ جاتے ہیں

خواب دہراتے ہوئے ڈرتا ہوں
ورنہ تاثیر میں گھٹ جاتے ہیں

آنکھیں مت پونچھیے اِس عشرے میں
اِن دنوں آئینے پھٹ جاتے ہیں

بارہا تیری طرف آتے ہوئے
بیچ رستے سے پلٹ جاتے ہیں

چھُو کے جب دیکھنا چاہوں دن کو
ہاتھ تاریکی سے اَٹ جاتے ہیں

تیری تصویر ادھوری ہے اَبھی
ہر دفعہ رنگ اُلٹ جاتے ہیں

☆☆☆

ضیاالمصطفیٰ ترک مہروی

سرِ زمین ، تہہِ آسماں تمام ہوئے
تمام لفظ یونہی ناگہاں تمام ہوئے

مسافرت کی کوئی سمت لازمی تو نہیں
یہ ریگ زار بھی کیا رائیگاں تمام ہوئے

محبتیں ہوئیں معدوم ، خیریت گزری
بھلا ہوا کہ میرے خوش گماں تمام ہوئے

میرے چراغ ، میرے راستے ، میرے منظر
کہاں ظہور ہوئے تھے ، کہاں تمام ہوئے

بس ایک لمحۂ زرّیں دمک رہا تھا ، میاں!
گزر چکا تو زمان و مکاں تمام ہوئے

تیری شبیہ اُبھر آیا چاہتی تھی کہ جب
یہ رنگ بھی سرِ آبِ رواں تمام ہوئے

شبیں تو خیر تھیں آئندگاں کے نام ، رہیں
ہمارے دِن بھی پس از رفتگاں تمام ہوئے

☆☆☆

ڈاکٹر عباس برمانی

آب.....سراب

''ذرا کیبنٹ کھولو درشن تو کریں۔''
''لیجئے جناب، ہمارے حقیر سے ذخیرے کو شرف بخشیے۔''
''اوہ گڈ.....بلیک ڈوگ، سمرلوف، ٹیچرز، رائل سلیوٹ.....واؤ.....شوازریگل۔''
''۲۵ سال پرانی ہے۔''
''تو ہو جائے.....اپنی پچیس پچیس سال پرانی بیگمات کے نام.....آ جاؤ ہماری نئی ساقیو.....
ساقی کی مونث کیا ہوتی ہے یار؟''
''ساقن ہوتی ہوگی شاید۔''
''یہ بی بیاں تو بہت ڈائنامک ہیں، ساکن تو وہ ہماری پچیس سال پرانی مسماتیں ہیں۔''
''واہ.....ساقن اور ساکن، کیا نکتہ آفرینی کی ہے؟''
''نکتہ آفرینی.....یہ کیا ہوتی ہے؟''
''یہ بھی ہوتی ہے یار.....آؤ بی بیو، لگاؤ ڈرنکس، گوبلٹس، آئس کیوبز، سوڈا اور پانی۔''
''یہ پانی کونسا ہے یار۔''
''منرل واٹر ہے نیسلے کا۔''
''کم آن یار، پاکستانی منرل واٹر! میں اپنی ڈرنک میں نہیں ملانے کا، یہ مخدوش پانی۔''

☆☆☆

آپ تو دفتر میں مزے کرتے ہیں۔ دوستوں کے ساتھ گپ شپ، چائے، سگریٹ.....باس کی سکریٹریاں۔ یہاں میرا سارا دن عذاب میں گزرتا ہے۔ آپ کے بچوں کی خدمت گزاری کرتے ہوئے، ان کی فرمائشیں پوری کرتے ہوئے.....ان کے ناز نخرے اُٹھاتے ہوئے.....سبزی نہیں کھائیں گے، دال ہندوؤں کی خوراک ہے، مرغی کا گوشت نہیں چلے گا برڈ فلو ہے.....مٹن میں بھی ہر ایک کی الگ فرمائش ہے۔ کسی کو چانپ چاہیے، کسی کو پسندے، کوئی کوفتوں کا شیدائی ہے تو کوئی کبابوں کا۔ پھر سویٹ ڈِش ضرور ہو اور سب کی الگ الگ پسند، کسی کو سادہ کسٹرڈ چاہیے تو کسی کو فروٹ کسٹرڈ، کوئی کھیر کھانا چاہتا ہے تو کوئی پڈنگ.....کام والی مائی صرف صفائی دُھلائی کرتی ہے، میں صبح سے رات تک کچن میں جلتی بھنتی رہتی ہوں۔ اس گھر میں ایک باقاعدہ کُک کی ضرورت ہے.....اور پھر انہوں نے روز نیا جوڑا پہننا ہوتا ہے اور بعض اوقات تو دن میں دو دو جوڑے، یونیفارم الگ.....دھوبی کے بل کا کچھ اندازہ ہے آپ

کو، پہلے مائی چھوٹوں کے کپڑے دھودیا کرتی تھی اب وہ بھی منہ بسورنے اور بڑبڑانے لگی ہے۔ کہتی ہے تنخواہ بہت کم ہے گزارہ نہیں ہوتا.....اوپر سے یہ پانی والے اللہ مارے.....اِدھر گرمیاں شروع ہوئیں اُدھر پانی غائب.....دن میں دوبار ڈیزرٹ کولر بھرنے پڑتے ہیں.....اور پھر کبھی کبھی تو ایسا میلا اور بدبودار پانی آتا ہے کہ خدا کی پناہ.....اور پینے کا پانی کب سے فلٹر نہیں بدلے گئے۔ کب سے کہہ رہی ہوں.....اتوار کا آدھا دن سوکر گزارتے ہیں اور آدھا دوستوں کے ساتھ گھوم گھام کر.....خدا جانے کہاں کہاں آوارہ گردی کرتے پھرتے ہیں، اتنا نہیں ہوتا کہ فلٹر بدلوالیں، ڈیڑھ سو روپے کا روزانہ منرل واٹر منگواتی ہوں، بیس ہزار روپے آپ ہر ماہ میرے ہاتھ پر دھرتے ہیں.....اور پھر مجھ پہ فضول خرچی کا الزام سوا لگ.....''

☆☆☆

''رسول حمزہ توف نے لکھا ہے کہ داغستانی خواتین کو سنے دینے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی..... ایسے ایسے کوسنے کہ آپ نے خواب میں بھی نہ سنے ہوں مثلاً ایک خاتون دوسری کو کوستے ہوئے کہتی ہے 'کاش جب تم کھانا کھا رہی ہو تمہاری دونوں آنکھیں نکل کر پلیٹ میں آ گریں'.....لیکن جو کوسنا داغستان میں سب سے بُرا سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کاش تمہارے بچے اپنی ماں کی زبان بھول جائیں۔''

''ارے نہیں صاحب مادری زبان بھلا کیونکر بھول سکتی ہے۔''

''بھول بھی جائے تو مصیبت میں تو منہ سے نکل ہی جاتی ہے۔'' آپ نے سنا ہوگا کہ کوئی صاحب اکبرِ اعظم کے دربار میں آتے تھے اور وہ ہر زبان اہلِ زبان کی مانند بولتے تھے۔ ان کا چیلنج تھا کہ کوئی ان کی مادری زبان بوجھ کر بتائے۔ ایک رات جب وہ گہری نیند میں تھے تو بیربل نے ان پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا تو وہ لگے بنگالی میں چیخنے چلانے۔''

''اور وہ غنیمت کنجاہی کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔''

''یہ کون ذاتِ شریف تھے۔''

''کمال ہے آپ غنیمت کنجاہی کو نہیں جانتے، فارسی کے بہت بڑے شاعر تھے، سنا ہے حضرتِ غالب نے اُن کی کئی بحریں اور زمینیں بلکہ مصرعے تک استعمال کیے ہیں۔ کنجاہ گجرات کے باسی تھے پنجابی بولنے والے.....

''آپ ان کا کوئی دلچسپ واقعہ سنانے لگے تھے۔''

''جی ہاں'' غنیمت کنجاہی کو فارسی بولنے کا جنون تھا اور وہ بھی اہلِ فارس کے لہجے میں۔ ایک روز کسی نواب کے باغ میں تشریف فرما تھے اور اپنی زباندانی اور فارسی آداب و اطوار سے اہلِ محفل کو انگشت بدنداں کیے ہوئے تھے کہ اچانک ایک بھڑ نے گردن پہ ڈنک مار دیا، انہوں نے چیخ ماری اور اُچھل پڑے، نواب صاحب نے وجہ دریافت کی تو ایک گندی سی گالی دے کر بولے ''پُونڈ لڑ گیا سی۔''

(بھڑ نے کاٹ لیا تھا)

''لیکن صاحب آپ اس واقعے کی کیا توجیہہ پیش کریں گے، وہ جو ایک ملتانی نوجوان فارسی کی تعلیم حاصل کر کے آیا تھا اور فارسی ہی بولا کرتا تھا، سرائیکی یا ملتانی اسے بالکل بھول گئی تھی، ایک بار اسے شدید بخار ہوا۔ پیاس کی شدت سے آب آب کرتا رہا اور اسی حالت میں جاں بحق ہو گیا۔ بعد ازاں کسی تعزیت کے لیے آنے والے نے پوچھا کہ بچے کو کیا تکلیف تھی تو ماں نے بتایا کہ اور تو کچھ پتہ نہیں البتہ مسلسل آب آب چلاتا رہا تھا اور جب اسے بتایا گیا کہ آب فارسی میں پانی کو کہتے ہیں تو وہ بیچاری عمر بھر یہ کہہ کر بین کرتی رہی ''آب آب کریندے مویوں بچڑا میڈا فارسیاں گھر گالیا'' (پیارے بیٹے آب آب کرتے مر گئے فارسی نے میرا گھر اُجاڑ دیا)۔

''ہاں ملتانی لوگ ایک استثناء ہیں، بے چاری پکی بھول جاتے ہیں مادری زبان۔''

''ویٹر آبِ مصفّا لانا۔''

''جی سر کیا کہا۔''

''پانی لے آیار۔''

''میاں سرکاری نل کا پانی تو نہیں، ہم غریب شاعر ادیب لوگ ہیں، کوئی ہیپاٹائٹس، اُبچ، پائلوری وغیرہ ہو گیا تو علاج کی استطاعت بھی نہیں رکھتے، بے موت مارے جائیں گے۔''

''نہیں سر واٹر سپلائی کا نہیں۔ ملک صاحب کے فارم سے آتا ہے۔ ۲۵۰ فٹ گہرا بور ہے، منرل واٹر سے اگر اکیس نہیں ہوگا تو انیس بھی نہیں ہوگا۔''

☆☆☆

''سائیں ڈاکٹر صاحب، پہلے میرے بچے کو دیکھیں، سائیں نمانا بالکل مٹی ہو گیا ہے۔ شودا پیلا ہلدی ہو گیا ہے.....ہفتہ ہو گیا ہے اسے ناک اور منہ سے خون آ رہا ہے۔ گلے میں زور کا درد ہوتا ہے جیسے اندر سے کوئی چھری کے ساتھ کاٹ رہا ہو، کوئی شے کھا سکتا ہے نہ پی سکتا ہے، پانی بھی گلے کو چبھتا ہے۔''

''ہفتہ ہو گیا ہے اور تم آج لے کے آئے ہو اسے۔''

''سائیں ہم دامان میں رہتے ہیں۔ رود کوہی کے علاقے میں، نہ سڑک ہے نہ سواری پہلے مُلا بھوپے سے پڑھوایا، آرام نہیں آیا تو اونٹ پر لاد کر قصبے لے گئے وہاں حکیم چار پانچ دن بوتلیں لگاتا رہا، لیکن سائیں خون رُک ہی نہیں رہا، جو کچھ جمع پونجی تھی سب لگ گئی، اب سائیں اُدھار لے کے آئے ہیں سُو دپر.....مہربانی کریں میرے بیٹے کو بچالیں۔ ہم اس کے ماں باپ ساری حیاتی آپ کے دَر کے غلام رہیں گے۔''

''تم لوگ پونجی نیم حکیموں پر لُٹا آتے ہو اور یہاں آ کر چیختے ہو کہ غریب ہیں۔ تم جاہل ہو محض

جاہل.....اور یہی جہالت ہی تمہاری غربت کی اصل وجہ ہے.....ہاں بچے سر پیچھے جھکاؤ، منہ کھولو.....شاباش بڑا سا، پورا منہ کھولو.....بند نہیں کرنا.....اوہ میرے خدا یہ تو جونک گلے میں چمٹی ہوئی ہے.....کسی گڑھے کا گندا پانی پیا تھا کیا؟''

''سائیں پانی تو ہم تالاب کا ہی پیتے ہیں، اللہ سئیں ناراض ہے سال بھر سے بارشیں نہیں ہوئیں، وہ تالاب بھی سوکھ رہا ہے، پانی میں آدھا کیچڑ ہوتا ہے، کوشش تو کرتے ہیں کپڑے کے ساتھ چھان کر پئیں، لیکن کب تک.....پھر بچے جو سارا دن بھیڑ بکریاں چراتے ہیں پیاس لگتی ہے تو بکریوں کے ساتھ یہ بھی تالاب کو منہ لگا کر پانی پی لیتے ہیں۔''

☆☆☆

''اس سامنے والے ٹیلے کے پار تو بہ ہے ہمت کرو۔''

''نہیں مجھ سے نہیں ہوتا، میں نہیں چل سکتا.....مجھ سے تو بولا بھی نہیں جا رہا میرا حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا ہے.....اور وہ ٹیلہ.....نزدیک لگتا ہے، لیکن میل سے ذرا بھی کم نہیں ہوگا۔''

''کوشش تو کرو یار، ہمت کرو، خدا مدد کرے گا۔''

''نہیں دوست.....نہیں ہوتا۔''

''سورج سر پر ہے کسی ٹیلے کی چھاؤں بھی نہیں، میں تمہیں اپنی چادر اُڑھا دیتا ہوں اسے اچھی طرح لپیٹ کر پڑ رہو، میں جاتا ہوں، خدا نے چاہا تو پانی لے کر آؤں گا۔''

''کوئی فائدہ نہیں دوست، چادر مجھے مت اُڑھاؤ تمہیں سفر کرنا ہے دھوپ اور لُو سے بچنا ہے.....میرے نیچے ریت ہے اوپر سورج.....اوپر نیچے آگ ہے.....چادر کہاں تک بچائے گی.....کہا سنا معاف کرنا.....الوداع۔''

''حوصلہ مت ہارو دوست میں آؤں گا.....پانی لے کر.....انتظار کرنا۔''

''آسمان آگ برسا رہا ہے، زمین آگ اُگل رہی ہے، ریت میرے قدموں کو جھلسا رہی ہے۔ میری آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلائی بن کر پھرتی ہے، لیکن میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ مجھے ٹوبے تک پہنچنا ہے، مجھے دوست کی جان بچانی ہے.....میں چل رہا ہوں میں چلتا رہوں گا۔ مجھے دوڑنا چاہیے بس ایک بار یہ ٹیلہ عبور کر لوں.....کسی بھی طرح.....اس کی پرلی طرف پانی ہے۔ ٹھنڈا میٹھا مہربان زندگی بخش پانی.....آہ میرا سر چکرا رہا ہے، بہت بھاری ہو گیا ہے.....نہیں یہ تو بہت ہلکا ہو گیا ہے، گویا شانوں پہ ہے ہی نہیں.....میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں، میں گر رہا ہوں، اُف، گرم ریت میرے نتھنوں، منہ اور حلق میں گھس گئی ہے اور انہیں بھون رہی ہے جیسے اماں گرم ریت میں دانے بھونا کرتی تھی.....اُٹھو ہمت مت ہارو ٹیلا آ گیا ہے، یہ چند قدم ہے.....مگر میں اس پر چڑھوں کیسے یہ بہت اونچا ہے اور بہت گرم ہے.....نہیں میں حوصلہ نہیں ہاروں گا، میں اس گرم ریت کا عادی ہو گیا ہوں، یہ اب اور کیا جلائے گی جتنا اس نے جلانا

تھا جلا لیا.....میں ٹیلے کی چوٹی پہ پہنچ گیا ہوں.....میرے خدا کیا خوش کن منظر ہے، یہ نیلے پانیوں کی اتنی بڑی جھیل، کبھی نہ دیکھی نہ سنی، وہ پیچھے کھجوروں کے جھنڈ، ہرنوں کے غول، پرندوں کی ڈاریں اور یہ سب کچھ چند ہی قدم کے فاصلے پر، مجھے خود کو ٹیلے سے نیچے لڑھکا دینا چاہیے جیسے ہم بچپن میں کرتے تھے۔ میں پانی میں ہی گروں گا اتنا نزدیک تو ہے.....میری فاصلہ ماپنے کی حس پیاس اور گرمی کی وجہ سے شاید متاثر ہو گئی ہے، یہ اتنا نزدیک بھی نہیں بیس پچیس قدم ہوگا.....نہیں ڈیڑھ دو سو قدم.....خیر اتنا دُور بھی نہیں.....یہ دور کیوں ہوتا جا رہا ہے.....اوہ میرے خدا یہ تو سراب ہے.....اے مہربان گرم ریت مجھے اپنی آغوش میں لے لے، میں ایک خستہ دیوار کی مانند تمہاری مہربان آغوش میں گر رہا ہوں کبھی نہ اُٹھنے کے لیے۔

☆☆☆

لیاقت علی

دو شرطیں

وہ اُٹھا اور خاموشی سے سگریٹ سلگاتا چل دیا تو میں سوچنے لگا میں اُسے کب سے جانتا ہوں! شاید اُس روز سے کہ جب تفریح کے وقت ہی اسکول سے بھاگ کر پڑوس کے محلے میں دو دو روپے کے دستی ٹکٹ لیے وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھنا ہمارا معمول تھا_____ یا پھر اُس روز سے کہ جب فضل دین کے گھر کی کنڈی کھٹکنے کا سبب نہ مل سکنے پر پورا محلّہ اسے کسی آسیب کا کام قرار دے رہا تھا اور میں دل ہی دل میں اپنی اس آگاہی پر خوش تھا کہ اس کنڈی سے بندھے باریک دھاگے کا دوسرا سرا تو خلیل کی انگلی سے بندھا ہوا ہے_____ یا شاید میری اُس سے ملاقات اُس روز ہوئی ہو کہ جب ہم خیام سینما کی اگلی نشستوں پر نہایت انہماک سے فلم دیکھ رہے تھے کہ واچ مین کی بیٹری کی تیز روشنی ہماری آنکھوں میں پڑی تھی اور کسی نے ہمیں کانوں سے پکڑ کر اُٹھایا تھا اور پھر گھر آتے آتے ان کانوں کی لویں جاپانی پھل کے کوالے ایسی ہوگئی تھیں!

خیر میں اُسے کب سے جانتا ہوں؟ اس بات کا اس کہانی سے کیا تعلق کہ جو میں آپ کو سنانا چاہ رہا ہوں۔

مجھے خبر ہے تو بس اتنی کہ زندگی اُس کے نزدیک اگر کچھ تھی تو فقط ایسی ہی کہ جیسا وہ پٹاخہ کہ جسے آگ لگا کر اُس نے سردیوں کی یخ بستہ رات کے پچھلے پہر اچانک قریشی صاحب کے صحن میں اُچھال دیا تھا اور پھر کچھ ہی دیر میں ہم کانوں میں انگلیاں ٹھونسے قریشی صاحب کو ڈھیلے پائجامے پر اُلٹا کرتہ پہنے تیزی سے گیٹ سے برآمد ہوتے اور بنا کسی سمت کے تعین کے دوڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

ہاں وہ ایسا ہی تھا۔ اُس وقت بھی کہ جب محلے کے کئی اوباش لڑکے اُسے مفت میں پیسٹریاں کھلوانا چاہتے تھے اور اُس وقت بھی کہ جب وہ اپنے مخصوص جسمانی اعضا پر اُگنے والے نئے نئے بھورے ریشمی بالوں کو چٹکی سے کھینچ کر سبھی ہم عمر دوستوں کو سینہ تان کر دکھایا کرتا تھا۔

میں ایک عمر سوچتا رہا کہ خلیل کبھی پریشان بھی ہو سکتا ہے؟ مگر یقین کیجیے میں اس گمان کو یقین میں کبھی نہ بدل سکا کیونکہ وہ زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں چھین لینے کا عادی تھا۔ وقت اس کے نزدیک جبر ہی نہ تھا تو مرہم کیونکر بنتا۔ ہر رُت جیسے اپنی آمد کا اعلان رازداری سے اُس کے کان میں کرتی اور پھر وہ گلی گلی اس راز کو پھلجڑیوں کی طرح اُڑاتا پھرتا۔

ہر بار گرمیوں کی پہلی بارش میں اپنی لمبی نیکر پر بنیان پہنے گھر سے سب سے پہلے میں نے اُسی کو نکلتے دیکھا۔ پھر باری باری وہ ہم سب کے گھروں کی کنڈیاں بھی آن کھٹکھٹاتا اور جوش سے کہتا۔

''آجاؤ بھی آجاؤ۔ کنویں کے مینڈک کو۔ آج باہر بہت پانی ہے۔''

یوں دیکھتے ہی دیکھتے ترتیب پاتی ہمارے محلے کے لڑکوں کی یہ ٹولی شہر کی بڑی شاہراہ پر اپنے جیسی دیگر ٹولیوں میں ضم ہو جاتی تو مجھے بیّ کے گردان کبوتروں کی وہ ٹکڑی یاد آجاتی جنہیں سرِ شام وہ سیٹیوں کے ہلنا شور میں فضا میں روانہ کرتا تو وہ شہر بھر سے اُڑنے والے کبوتروں کی دیگر ٹکڑیوں میں مل کر ایک بڑے غول کی شکل اختیار کر لیتی۔ ہر طرف سے وہ کبوتر بازوں کی فلک بوس سیٹیاں اور آوازیں اس غول کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرتی چلی جائیں اور پھر بیّ چنگیر میں رکھا باجرا فضا میں اُچھالتا تو اُس کے کبوتروں کی ٹکڑی غوطہ کھاتی اس غول سے یوں کٹ کر چھت پر آن اُترتی جیسے بڑے ریشمی کپڑے کے تھان سے کوئی اچانک اپنی ضرورت کا کپڑا پھاڑ کر الگ کر لے۔ ایسے میں دیگر ٹکڑیوں سے بچھڑا بھولا بھٹکا کوئی نیا کبوتر اس فریب کو نہ سمجھتے ہوئے چھت پر آن اُترتا تو ڈر ڈر کر دانہ چگتے ہوئے بیّ اُسے نہایت مہارت سے اپنے دوغزے سے یوں قابو کرتا کہ آن کی آن میں کبوتر کے دل کی تیز دھڑکن اُسے اپنی ہتھیلی پر محسوس ہو رہی ہوتی اور جیت کی سرمستی میں اِک فلک بوس سیٹی اُس کے گلے کو چیرتی ہوئی حریف کبوتر باز کے دل میں جا پیوست ہوتی۔

بارش میں بھٹکتے اور سڑکوں پر پانی اور کیچڑ اُچھالتے ان لڑکوں کی مختلف ٹولیاں بھی اپنی انفرادی شناخت سے بے پرواہ ایک بڑے ٹولے کی شکل اختیار کر جاتیں تو اچانک واپسی کے پروگرام میں بھولے ہوئے اُس کبوتر کی طرح کوئی معصوم کسی دوسری ٹولی کے ہتھے چڑھ جاتا تو اُس کے پلٹنے پر سو سو قیاس جنم لیتے اور اُس کے باقی سنگی ساتھی اُس کی ننگی رانوں اور گیلے کولہوں پر چٹکیاں بھر بھر کر پوچھتے ''بلو کتھے رہ گئی سی؟''، ''بلو اجیں کنواری اے؟''، ''بلو اج بھجی کہ نئیں؟''

ایسے میں وہ بیچارہ مزید کھسیانہ ہوتا ٹپ ٹپ آنسو بہاتا، خود سے مضبوط پٹھوں کے اِن لڑکوں کو غصے سے گالیاں دیتا گھر سے بھاگ جاتا تو وہ خلیل ہی تھا جو بالآخر اسے منا کر واپس لے آتا۔

عید، بقر عید پر بھی ایک عرصے تک میں نے جس شخص کو سب سے پہلے عمدہ نفیس سوٹ پہنے، چشمہ لگائے، چمکتے ہوئے جوتوں کے ساتھ محلے کی گلیوں میں نکلتے دیکھا کوئی اور نہیں خلیل تھا۔ ایسے میں وہ اپنی سامنے کی جیب سے جھلکتے سو سو کے نوٹوں میں سے ایک نیا نوٹ نکال کر دکاندار کو اس بے نیازی سے کہتا ''بوتلیں بھئی'' کہ وہ اُسے غور سے دیکھتا رہ جاتا کہ وہ اُس سے مخاطب ہے یا کسی اور سے کہہ رہا ہے۔

اُدھر ہم سب بوتلوں کے اس آرڈر کے ساتھ ہی خلیل کے سوٹ بوٹ اور ٹھاٹھ باٹھ کے قصیدے پڑھنے لگتے۔

ابھی گرمیوں کا آغاز بھی نہ ہو پاتا کہ خلیل واٹر پائپ تھامے گھر کے سامنے چھڑکاؤ کرتا دکھائی دیتا۔ پھر سرِ شام یہاں کرسیاں سجتیں اور رات دیر تک دوستوں کی اس محفل میں خوش گپیاں چلتیں کیونکہ خلیل نسبتاً کھاتے پیتے گھرانے کا اکلوتا بیٹا تھا اور اُس کے والد بھی سعودی عرب گئے ہوئے تھے تو دوستوں کو ایک آدھ مرتبہ سکواش کا گلاس مل جانا بڑی بات نہ تھی۔

بسنت قریب آنے کی خبر بھی ہمیں ہمیشہ خلیل ہی سے ملتی رہی، جو گولی والی بوتل کو لوہے کی

حمام دستی میں کوٹتا، چھانتا، سریش اور رنگ کے اس آمیزے کو سلور کی پرانی دیگچی میں چولہے پر چڑھائے مانجھا بناتا اور پھر اعلیٰ دھاگے کی عمدہ ڈور تیار کرتا دکھائی دیتا۔ اُس وقت کہ جب محلے کے دیگر لڑکوں کے پاس ڈور کے چھوٹے بڑے گول پنّے ہی دکھائی دیتے تھے، ہم نے پہلی بار خلیل کے ہاتھ میں خوب صورت رنگ دار چرخی دیکھی۔

ہاں وہی چرخی کہ جو تیزی سے گھومتی تو اُس پر تازہ لگی ہوئی یہ ڈور ہی نہ لپٹتی ہمارے دل میں جیسے گھوم گھوم کر لپٹتے چلے جاتے۔ ہم میں سے ہر ایک خلیل کے پیچھے دونوں ہاتھوں کو گول دائروں میں اس چرخی کو پکڑے اوپر آسمان پر اُڑتی پتنگ کو دیکھنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتا۔ اُس لمحے اگر کوئی دنیا کے خوش قسمت ترین شخص کا نام پوچھتا تو ہم کتنی آسانی سے خلیل کا نام لے سکتے تھے۔

پھر اسی طرح آہستہ آہستہ ہوا میں پھیلتی خنکی ابھی سردیوں کی آمد کا پتہ ہی دے رہی ہوتی کہ خلیل کی چین پر مختلف قسم کی لیدر جیکٹس دکھائی دینے لگتیں کہ جنہیں پہن کر وہ نکلتا تو ہم اپنی لنڈے کی سویٹروں میں ہی کہیں چھپ جانا چاہتے۔

میں نے اُسے کبھی باقاعدہ اسکول کالج کے طالب علم کی حیثیت سے تو نہ دیکھا مگر گاہے بگاہے اتنی خبر ضرور ملتی رہی کہ اَب اُس نے میٹرک کر لیا، اب ایف اے اور پھر بی اے۔ یہ خبر بھی محض سرگوشی نہ ہوتی بلکہ قریشی صاحب کے صحن میں پھٹنے والے پٹاخے کی مانند اس کی گونج بھی پورے محلے میں سنائی دیتی اور پھر اس گلّوں اور برفیوں کی مٹھاس سے شیریں ہجوں میں ایک سے دوسرے کان میں منتقل ہوتی چلی جاتی۔

چھوٹے بڑے کسی بھی نوع کے الیکشن قریب آتے تو خلیل کی بیٹھک دیکھتے ہی دیکھتے کسی پارٹی کے دفتر میں ڈھل جاتی۔ پارٹی کا ایک قد آدم جھنڈا اور امیدوار کا بڑا پورٹریٹ اوپر چھت پر آن سجتا اور محلے بھر کے بچے بے شمار اسٹیکر، بیج، اشتہار اور بینرز اسی بیٹھک سے لیتے دوڑتے بھاگتے دکھائی دیتے۔ رات دو دو بجے تک فارغ البال سیاسی مبصروں اور مفت خوروں کی محفلیں بپا ہوتیں جو چاولوں اور چائے کی پیالیوں پر پارٹی منشور اور موجودہ سیاسی صورت حال میں اس کے حق میں دھواں دھار تقریریں کرتے اور بحث مباحثے چلتے۔

پھر الیکشن کے روز آس پاس کے پندرہ بیس پولنگ اسٹیشن تو جیسے خلیل کی ذمہ داری بن جاتے۔ محلے کے ہر گھر میں ووٹنگ لسٹ میں موجود نمبر شمار کی نشان دہی کرتی۔ پرچیاں تقسیم ہوتیں، پولنگ اسٹیشن کے نام طے ہوتے اور مختلف موٹر سائیکلوں، رکشوں، ٹیکسیوں اور ویگنوں کا ایک ٹولہ اُس کی زیر ہدایت صبح پانچ بجے ہی اُس کے گھر کے سامنے آن پہنچتا اور پھر شام پولنگ کے خاتمے تک وہ چھلاوے کی طرح ایک سے دوسرے پولنگ اسٹیشن پر ووٹروں کو پہنچاتا، لے آتا دکھائی دیتا۔

شومئی جو مطلوبہ امیدوار جیت جاتا تو اس کی یہی بیٹھک اب کسی حلوائی کی دکان میں ڈھل جاتی۔ پٹاخے بجتے، ڈھول پیٹے جاتے اور کئی روز تک مٹھائی تقسیم ہوتی رہتی۔

بعد ازاں اس سیاسی جدوجہد کا ثمر یہ ملتا کہ ہر دوسرے روز کوئی نہ کوئی سائل خلیل کے موٹر سائیکل پر اُس کے پیچھے بیٹھا دکھائی دیتا کہ جسے لیے وہ شہر بھر کے سرکاری محکموں میں لڑتا جھگڑتا نظر آتا۔

وہ یہ سب کس لیے کر رہا تھا؟

بہت دیر تک لوگ اس مفاد کی ٹوہ لگاتے رہے لیکن کسی ایسے مفاد کو تلاش نہ کر سکے کہ جو اس ساری مشقت کا حاصل قرار دیا جا سکے۔ شاید اُس کا فطری اضطراب تھا جو اُسے لوگوں سے کاٹ کر کسی بند کمرے میں زندہ نہیں رکھ سکتا تھا!

ہاں لے دے کے اس کو کوئی ایک مفاد ملا بھی تو وہ اُس کی نوکری تھی۔

ایک روز دیگی چاولوں کی تقسیم ہوئی پلیٹوں کے ساتھ یہ خبر بھی ملی کہ خلیل سرکاری ملازم ہو گیا ہے مگر یہ کوئی بڑی افسرانہ ٹھاٹھ باٹھ والی نوکری ہرگز نہ تھی بلکہ یہ محکمہ ڈاک میں درمیانے درجے کی ایسی ملازمت تھی کہ جس نے اُس کے شب و روز میں فقط اتنی تبدیلی پیدا کی کہ اَب پرانی کی جگہ نئی موٹر سائیکل دکھائی دینے لگی۔

وقت یونہی گزرتا رہا۔ ہم تمام ہم عمر دوستوں میں اب اِک وہی تھا کہ جس نے اَب تک شادی نہیں کی تھی ورنہ ہم سب اب اپنے دو دو تین تین بچوں کی انگلیاں پکڑے، بڑھی ہوئی توندوں اور سفید ہوتے بالوں کے ساتھ زندگی سے ایک خاموش مفاہمت پیدا کر چکے تھے لیکن خلیل شاید وقت کے اس جبر کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر رضامند نہ تھا۔

چالیس برس کی عمر اور سرکاری ملازمت کی ان بیڑیوں نے اگرچہ اُس کے اضطراب کو ایک تحمل میں تو ڈھال دیا تھا مگر اپنی بے ڈول ہوتی جسامت اور چہرے پر اُترتی فطری پختگی کے باوجود وہ لباس کے معاملے میں اب بھی اُسی طرح رنگین مزاج تھا جیسا کہ کبھی نوجوانی میں ہوا کرتا تھا۔ لوگوں کے ردِعمل کی پرواہ کیے بغیر اب بھی تنگ جینز پر شوخ رنگوں کی شرٹس پہنتا اور مختلف نوع کے چشمے لگائے محلے میں نکلتا تو یہ بات بھول جاتا کہ کپڑوں کی دوشیزگی میں انسانوں کی بڑھتی ہوئی عمروں کو نہیں چھپایا جا سکتا۔

گانوں اور فلموں کے معاملے میں بھی ہم میں سے بیشتر دوست یا تو سرے سے اس شوق سے ہی دستبردار ہو چکے تھے یا پھر اپنی جوانی کے یادگار واقعات کی یاد دلائی بعض فلموں اور نغموں ہی میں وقت جیسے اُن کے ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر خلیل کی بیٹھک ہمیشہ کی طرح اب بھی ہر نئے گانے کی خبر نشر کرتی رہی۔ اب جب کہ عمر کا چوالیسواں برس بھی گزرنے کو تھا۔ آہستہ آہستہ یہ نغمے پہنے قوالیوں اور پھر نعتوں میں ڈھلنے لگے اور دھیرے دھیرے خلیل نہ صرف یہ کہ خود بھی مسجد کی رونق میں اضافہ کرنے لگا بلکہ دیگر دوستوں کو بھی اس نیک کام کی دعوت دینے لگا۔

پھر معلوم ہوا وہ دفتر سے تین ماہ کی رخصت لے کر کسی تبلیغی مشن پر بیرون ملک چلا گیا ہے۔ واپسی پر ایک متناسب داڑھی بھی اُس کے چہرے پر دکھائی دی۔

اب اُسے خیال آیا کہ اُسے شادی کر لینی چاہیے۔ دوستوں اور رشتے داروں سے مشورے

ہوئے اور اُس نے شادی کے لیے دو شرائط پیش کیں۔

ایک یہ کہ لڑکی کم عمر ہو تو دوسری یہ کہ نہایت نیک اور دین دار ہو۔

کچھ زیادہ وقت نہیں لگا کہ قریبی علاقے کے ناظم مولانا احمد دین کی چھوٹی صاحبزادی کہ جس نے ابھی حال ہی میں قرآن حفظ کیا تھا اور اب میٹرک کے امتحانات کی تیاری کر رہی تھی، دلہن بن کر خلیل کے گھر آن موجود ہوئی۔

پھر کئی مہینوں تک ہم نے خلیل کو گھر سے کم کم نکلتے دیکھا۔ کبھی کبھار اُس کی بیوی بھی موٹر سائیکل پر اُس کے ساتھ دکھائی دیتی۔ مگر دکھائی کہاں دیتی سر سے پاؤں تک اس کا غلاف نظر آتا۔ یہاں تک کہ گرمیوں میں بھی کھلی چپل میں جرابوں والے پاؤں اور چادر سے نکلتے سفید کپڑے کے دستانوں والے ہاتھ نظر آتے تو یہ تجسس مزید پَر پھیلانے لگتا کہ خلیل کی بیوی کیسی ہوگی؟

ایک دو برس اسی طرح گزر گئے کہ پھر خلیل آہستہ آہستہ پھر سے ہم دوستوں کو ڈھونڈتا دکھائی دیا۔ اب کم و بیش ہر دوسرے روز وہ ہمارے گھر پر آن دستک دیتا اور اُس کی خواہش ہوتی کہ ہم دیر تک ساتھ رہیں۔ جوانی کی اُنہی محفلوں کو پھر سے آباد کرنے کی خواہش میں کچھ روز تو ہم سب بھی بڑی خوش دِلی سے اکٹھے ہوئے۔ ایک قریبی چائے خانے پر رات دیر تلک آزادی کے اس نئے احساس اور ماضی سے جڑنے کی اس خوبصورت کوشش نے کئی راتیں بھی خوب سجائیں مگر پھر آہستہ آہستہ گھر میں بیویوں کے فساد اور بچوں کی مصروفیات نے اِن محفلوں میں ہماری مقدار کو کم کرتے کرتے کم و بیش ختم کر دیا۔

لے دے کر ایک خلیل اور میں آن بچے کہ جو ہر رات عشاء کے بعد دیر تک اس ہوٹل میں آن بیٹھتے، چائے منگواتے اور کئی کئی گھنٹے ماضی کی یادوں کو کریدتے گزار دیتے۔

یہ نشستیں بھی کوئی بہت دیر نہیں چلیں کہ انہیں چند ہفتوں میں، مَیں نے اچانک خلیل کی جدائی کو بڑھاپے میں ڈھلتے ہوئے دیکھا۔ وہ فاصلہ جو ہم سب نے کئی برس میں نہایت غیر محسوس طریقے سے طے کیا تھا خلیل کے ہاں ہفتوں اور دنوں میں طے ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اُس کی ہمیشہ منڈھی ہوئی داڑھی پر اگرچہ گزشتہ دو برس سے ایک متناسب داڑھی آن سجی تھی مگر اُس کی سفیدی کا پتہ انہی چند مہینوں میں ملنا شروع ہوا تھا۔ سر کے بال بھی اب اُس نے رنگنا چھوڑے تو جیسے سفید بالوں نے کسی وائرس کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے پرانے کپڑوں اور گھسی ہوئی چپل والے ایک اُدھیر عمر شخص کو سامنے لا کھڑا کیا۔

سر اور داڑھی کے بے ترتیب سفید بالوں سے بے خبر یہ اُدھیر عمر شخص واقعی خلیل ہے؟ یہ یقین کرنا شاید اتنا آسان نہ تھا۔

اسی دوران میں نے طے کر لیا کہ کسی طرح اُس کی پریشانی کا سبب جان سکوں مگر ہر بار دو بات ٹال جاتا۔ گھر اور بیوی کا ذکر قدرے بے زاری سے کرتا اور میں اگر کچھ تفصیل سے جاننے کی کوشش کرتا تو جھلا کے کہتا ''چھوڑو کوئی اور بات کرو۔''

پھر اِس روز یہ خبر بھی جنگل کی آگ کی طرح پورے محلے میں پھیلی کہ خلیل نے بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ کئی سرگوشیوں نے سر اُٹھایا، سو سوال پیدا ہوئے اور ہر شخص نے اپنے اپنے طور پر کچھ نہ کچھ نتیجہ اخذ کیا مگر خلیل نے مجھے جو کچھ بتایا وہ سچ تھا یا نہیں ہاں عجیب ضرور تھا۔

اُس رات اُس کا اضطراب جھلک جانا چاہتا تھا۔ اُسے ایک کنواں درکار تھا جہاں وہ اپنا ہر احساس اُگل دے۔ اِدھر میرا تجسس کسی ہمدردی میں ڈھل گیا تو اُسے لگا وہ مجھ سے ہر بات کہہ سکتا ہے۔

''کہنے لگا تم تو جانتے ہی ہو کہ میں نے شادی کے معاملے میں دو خواہشوں کا اظہار کیا تھا۔''

اُس نے شرائط کو خواہشوں کا نام دیتے ہوئے کہا تو میں نے خود ہی اگلی بات کہی کہ ''کم عمر اور نیک ہو۔''

''ہاں'' اُس نے تاسف کا اِک گھونٹ بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو کیا ایسا نہیں تھا؟''

''نہیں تھا تو ایسا ہی۔''

اُس نے آہستگی سے جواب دیا تو میں نے چائے کی پیالی اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا ''تو پھر کیا ہوا؟''

''بس ہونا کیا تھا شاید ہم دو مختلف سیاروں کے باسی تھے جو ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے بھاگتے آخر تھک کر بیٹھ گئے تھے۔ ندی کے دو متوازی کناروں کی مانند ساتھ ساتھ مگر جُدا جُدا۔

ایسے وقت میں کہ جب زندگی اُس کے لیے صرف حیرت کا نام تھا میرے لیے ایک عارضی معمول بن گئی تھی۔ وہ فلم میں مرتے ہوئے کسی کردار کو دیکھ کر رونے لگتی تھی اور میرے لیے کسی زندہ کردار کا چلے جانا بھی عارضی معمول بن گیا تھا۔

وہ بھرے بازار میں کسی بندر والے کو دیکھ کر تالیاں بجانے لگتی۔ خوشی سے گلکاریاں مارتی اور بندر کی حرکتوں پر ہنس ہنس کے اُس کے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ ایسے میں لوگوں کے ردِعمل کی پرواہ کیے بغیر وہ میری جیب سے بٹوہ نکال لیتی اور جھٹ سے پچاس سو کا نوٹ بندر والے کو تھما دیتی۔ بندر جواب میں سلیوٹ کرتا تو اُسی اہتمام سے اُسے جواب دیتی اور میں خوشی اور سرشاری کے اِن لمحوں میں ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ سجائے ماتھے کا پسینہ پونچھتا رہتا۔

لوگوں کی آنکھوں اور مسکراہٹوں سے برآمد ہوتے سوال نہ چاہتے ہوئے بھی میرے کانوں سے ٹکراتے رہتے کہ جو ہمارے بیچ کسی رشتے کی دریافت میں اِس تذبذب کا شکار دکھائی دیتے۔ بڑا بھائی.....نہیں باپ.....نہیں نہیں میاں۔ میاں!

اُف خدایا۔

بے شرم۔ بے حیا۔ ذلیل۔

اور پھر اُن کے نفی میں ہلتے سر اِن سارے جملوں کی گونج میرے کانوں میں انڈیل دیتے کہ

جنہیں صرف میں سنتا اور وہ کسی بھی احساس سے بے خبر ہنستے ہوئے موٹر سائیکل پر میرے پیچھے آن بیٹھتی اور پھر لپٹ کر پوچھتی ''نقاب اُتار دوں؟'' میں خاموش رہتا۔ پلیز!

ہرگز نہیں۔ میں سختی سے کہتا تو اُس کی گرفت از خود ڈھیلی پڑتی جاتی۔

پھر کچھ ہی عرصے میں مجھے حیرت اور سرشاری سے نہال کر دینے والا اُس کا رنگ روپ اور جوانی بھی اچانک میرے حریف بننے لگے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا وہ میرا مذاق اُڑاتی ہے۔ وہ کھل کر قہقہہ لگاتی تو مجھے لگتا وہ میری بے بسی پر ہنس رہی ہے۔ میں کوئی نیا سوٹ پہنے خوشبو لگا رہا ہوتا تو کنکھیوں سے مجھے دیکھ کر مسکرا دیتی۔''

''ممکن ہے وہ اپنائیت اور تمہاری وجاہت کے احساس سے مسکراتی ہو؟''

میں نے کہا تو وہ فوراً بولا۔ ''تو پھر فون کیونکر انگیج رہنے لگا تھا گھر کا؟''

''فون انگیج رہنے لگا تھا!''

میں نے تشکیک بھرے انداز میں اس کا جملہ دہرایا تو وہ کہنے لگا۔

''ہاں میں محسوس کر رہا تھا گھر کا فون اب میری غیر موجودگی میں انگیج رہنے لگا ہے۔ پھر ہر شام دفتر سے گھر واپسی پر سیاہ لمبے بال دھو کر سنوار رہی ہوتی تو مجھے احساس ہوتا اِن سے اب کوئی نامانوس مہک آنے لگی ہے۔ وہی مہک جو آغاز میں میرے اندر طمانیت اور سرشاری کی کئی لہریں پیدا کر دیتی تھی اب میری رگوں میں طنز اور شرمندگی کی کڑواہٹ اُتارنے لگی تھی۔

میں چاہتا تھا کہ اُسے صرف میں دیکھوں، صرف میں چھو پاؤں اور تو اور اُس کی آواز بھی صرف میری ملکیت ہو۔ حق ملکیت کا یہ عجب ضبط تھا جو آہستہ آہستہ میری نیندیں حرام کر رہا تھا۔ مجھے وہم ہونے لگا تھا کہ یہ آواز، یہ لمس، حُسن اور یہ احساس صرف میرا نہیں ہے۔ یا شاید یہ میرا کیسے ہو سکتا ہے؟

ایسے میں کہ جب میں برسوں پیچھے پلٹ جانا چاہتا تھا زندگی ہر نئے دن کے ساتھ مجھے برسوں آگے دھکیلتی جا رہی تھی۔

پھر اِس روز جب میری ایک عزیزہ نے یونہی اس سے پوچھ لیا کہ ''بہو کوئی خوشخبری بھی سناؤ گی؟'' تو جانتے ہو اُس نے کیا کہا؟''

''کیا کہا؟'' میں نے اب اس قصے کو نہایت دلچسپی سے سن رہا تھا۔

کندھے اچکا کر ہنستے ہوئے بولی۔

''آپا مجھے نہیں معلوم انہی سے پوچھیے نا''!

''انہی سے پوچھیے نا!''

تم جان سکتے ہو اس جملے میں کیسی کاٹ تھی۔ کتنا زہر بھرا ہوا تھا۔ کیسی سفاکی تھی جو خانوں سے روح تک کسی خنجر کی طرح اُتر گئی تھی۔''

''انہی سے پوچھیے نا!''

گویا میں ہی تو اس خوشخبری کی راہ میں ایک بُرا بند تھا جو لوگوں کے منہ میٹھے ہونے میں رکاوٹ بن رہا تھا۔

''خیر یہ ایسی بات نہ تھی۔ تم یونہی سوچ رہے ہو۔ ممکن ہے اُس نے جھینپ کے کہہ دیا ہو؟''

میں نے اُس کے غصے سے کپکپاتے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ بولا: ''نہیں ہیں۔ وصی میاں میں جانتا ہوں اُسے کہ وہ کہاں سے بول رہی تھی۔ مجھے خبر ہے۔ رات کی تنہائیوں میں بھی جب میری سانسیں پھول جائیں اور میں فرض سے سبکدوشی کے اِس حسین احساس کے ساتھ بستر پر جا گرتا تو وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی کوئی بات نہیں خلیل پھر سہی!''

پھر سہی!

اس پھر سہی کو جانتے ہو تم۔ کتنی سفاک ہمدردی ہے یہ پھر سہی!

گویا میں کوئی مکڑا تھا جو آہستہ آہستہ جال بُن رہا تھا تاکہ کوئی بادشاہ میرے استقلال اور بالآخر کامیابی سے سبق سیکھتے اور اپنے پھینکے ہوئے ہتھیار پھر سے اُٹھائے میدانِ جنگ میں نکل جائے۔''

پھر سہی!

''خلیل تم واقعی ہمدردی کے لائق ہو۔''

میں نے اُسے یہاں ٹوک کر کہا تو وہ جھلا کر بولا: ''بکواس نہیں کرو۔ جس چیز کا علم نہ ہو اس پر رائے نہیں دینی چاہیے۔''

''ہاں خیر یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔''

''خیر پھر کیا ہوا؟''

پھر اُس نے اِک طویل ٹھنڈی سانس لی اور بولا پھر نجانے مجھے کیا ہو گیا کہ میں بات بے بات اُسے روکنے ٹوکنے لگا۔ پھر یہ روک ٹوک زبان سے ہاتھوں میں اُتر آئی اور کئی بار میں نے اسے جسمانی اذیت بھی پہنچائی اور نتیجتاً وہ آہستہ آہستہ ۱۶ سال کی ہنستی مسکراتی شوخ شرارتی لڑکی سے کسی ۶۰ سالہ بڑھیا میں ڈھل گئی۔

عبادت اُس کا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔

''مگر یہی تو تمہاری دوسری شرط تھی نا؟''

میں نے اُسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

ہاں شرط تو میری ہی تھی مگر ہر شے میں کوئی اعتدال تو ہونا چاہیے نا۔ وہ تو اعتدال کی یہ تمام حدود پھلانگ گئی تھی۔ اب یہ روزمرہ کے معمولات جو کبھی میرے لیے بے معنی ہوتے جا رہے تھے اُس کے لیے بھی انسان کو بہکانے کے شیطانی ذرائع بن گئے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں، تفریح محبت یہ سب اُس کے لیے بے معنی ہو گئے تھے حالانکہ یہ سب چیزیں تو اُس کی خواہش تھیں۔ آغاز میں، میں اس تبدیلی پر

خوش ہوا۔ مجھے لگا بالآخر وہ مجھے سمجھ گئی ہے اور اب میری پسند کی زندگی جی رہی ہے۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ مجھے اُسے مستقل جائے نماز سے اُٹھا کر بستر پر لانا بھی کسی احساس گناہ میں مبتلا کرنے لگا۔

''اور خود اُس کا ردِعمل کیا تھا؟''

میں نے پوچھا تو وہ کچھ دیر سوچتے ہوئے بولا: ''اُس کا ردِعمل بالکل مشینی سا تھا۔ میری کسی بات سے انکار نہیں کرتی تھی مگر میرے قہقہے میں اب اپنا قہقہہ شامل کرتے ہوئے اُسے ڈر لگنے لگا تھا۔ بس اس ساری صورتِ حال نے مجھ میں ایک عجب جھلاہٹ پیدا کر دی تھی۔ وہ اگرچہ وہی بن گئی تھی جو میں چاہتا تھا لیکن ایسے میں اِک نیا سوال میرے سامنے تھا کیا میں یہی چاہتا تھا؟

آخر آخر میرے پاس صرف یہی حل آن بچا کہ ہم ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو جائیں۔''

''مگر کیا تم نے اُس کے ساتھ زیادتی نہیں کی؟''

میں نے پوچھا تو اُس نے اپنی آنکھوں کے ترکو نے صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

''سچ پوچھو تو یہ مشورہ بھی اُس کا تھا۔ وہ بات جو میں محض محسوس کر رہا تھا اُس نے اس روز مشورے کی صورت میرے سامنے رکھی اور میری مشکل آسان کر دی۔

''خیر جو بھی ہوا جیسے بھی ہوا کچھ اچھا نہیں ہوا'' میں نے اب اُسی کے قدرے مطمئن چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اور اب کیا ارادے ہیں؟''

''اب!''

وہ کچھ دیر خلا میں گھورتا رہا اور پھر اِک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بولا: ''پتہ نہیں؟''

کچھ تو پتہ ہوگا؟

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

کچھ پل بنا کوئی جواب دیے میری طرف غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اُٹھا اور خاموشی سے سگریٹ سلگاتا چل دیا۔

میں نے آواز دے کر اُسے روکنا چاہا مگر خاموش رہا اور ویٹر کو چائے کا بل ادا کرتا گھر چلا گیا۔

کچھ روز بعد یہ خبر بھی قریشی صاحب کے صحن میں پھٹنے والے پٹاخے کی مانند پورے محلے میں پھوٹی کہ خلیل پھر سے شادی کر رہا ہے۔

''اُنہی دو شرطوں کے ساتھ؟''

میں نے طنزاً ہم دونوں کے اِک مشترکہ دوست سے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنسا اور پھر اُس کی بڑھی ہوئی ہتھیلی پر زور سے پڑتی میری ہتھیلی کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی۔

ظفر اقبال

ایک ہی بار نہیں ہے یہ، دوبارہ کم ہے
میں وہ دریا ہوں جسے اپنا کنارہ کم ہے

وہی تکرار ہے اور ایک وہی یکسانی
اس شب و روز میں اب اپنا گزارہ کم ہے

میرے دن رات میں کرنا نہیں اب اس کو شمار
حصۂ عمر کوئی میں نے گزارا کم ہے

میں زیادہ ہوں بہت اُس کے لیے اب تک بھی
اور، میرے لیے وہ سارے کا سارا کم ہے

اُس کی اپنی بھی توجہ نہیں مجھ پر کوئی خاص
اور میں نے بھی ابھی اُس کو پکارا کم ہے

آج پانی جو اُچھلتا نہیں پہلے کی طرح
ایسا لگتا ہے کہ اس میں کوئی دھارا کم ہے

ہاتھ پر آپ ہی میں مار رہا ہوں فی الحال
ڈوبتے کو ابھی تنکے کا سہارا کم ہے

میں تو رکھتا ہوں بہت روز کے روز اِن کا حساب
آسماں پر کوئی آج ایک ستارہ کم ہے

پیش رفت اور ابھی ممکن بھی نہیں ہے کہ ظفر
ابھی اُس شوخ پہ کچھ زور ہمارا کم ہے

ظفر اقبال

کچھ دنوں سے جو طبیعت مری یکسو کم ہے
دل ہے بھرپور مگر آنکھ میں آنسو کم ہے

تجھے گھیرے میں لیے رکھتے ہیں کچھ اور ہی لوگ
یعنی تیرے لیے یہ حلقۂ بازو کم ہے

توڑ جیسے ہے کوئی اپنے ہی اندر اِس کا
ورنہ ایسا بھی نہیں ہے ترا جادو کم ہے

میں اِن آفاتِ سماوی پہ کروں کیوں تکیہ
کیا مری ساری تباہی کے لیے تو کم ہے

رنگِ موسم ہی محبت کا دیا جس نے بگاڑ
شہر بھر کے لیے کیا ایک ہی بدخو کم ہے

پیڑ کی چھاؤں پہ کرتی ہے قناعت کیوں خلق
اور، کیوں سب کے لیے سایۂ گیسو کم ہے

زندگی ہے وہی صد رنگ مرے چاروں طرف
کچھ دنوں سے مگر، اس کا کوئی پہلو کم ہے

وہ بھی جامے سے ہُوا پھرتا ہے باہر، اور کچھ
دل پہ اپنا بھی کئی روز سے قابو کم ہے

شاعری چھوڑ بھی سکتا نہیں میں ورنہ، ظفر
جانتا ہوں اِس اندھیرے میں یہ جگنو کم ہے

☆☆☆

ظفر اقبال

پانی اتنا ہے کہ اس کے لیے دریا کم ہے
میری آوارہ خرامی کو یہ دُنیا کم ہے

منتظر میں بھی کنارے پہ کھڑا ہوں اُس کا
ایک صورت جو ابھی دشت میں پیدا کم ہے

میں سمجھتا رہا کافی جسے آتے جاتے
مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنا کم ہے

اس تجارت کی سمجھ ہی نہیں آئی اَب تک
نفع جس میں ہے زیادہ نہ خسارہ کم ہے

صبر آتا ہی نہیں مجھ کو کسی بھی صورت
وہ تو میرے لیے جتنا بھی ہے، سارا کم ہے

شہر میں اُس کے نہ ہونے کی تلافی کیا ہو
یہ کمی یوں ہی رہے گی کہ وہ ایسا کم ہے

میں اِسی وجہ سے جاتا نہیں اکثر اُس سمت
باغِ دل میں مرے حصے کا تماشا کم ہے

بس بیاں کی بھی جگہ رنگِ بیاں ہے یکسر
میرا ملبوس زیادہ ہے ، سراپا کم ہے

ظفر آیا نہیں اس کو بھی کبھی آپ خیال
اور ، اپنا بھی کئی دن سے تقاضا کم ہے

ظفر اقبال

شور اگلا سا جو ہر سمت برابر کم ہے
زور اِس طبعِ رواں کا مرے اندر کم ہے

اس چکا چوند سے ہٹ کر نہیں رہ سکتا میں
روشنی آج مرے خواب سے باہر کم ہے

ایک رفتار ہے دونوں کی وہی ایک طرف
بوجھ اُڑتے ہوئے بادل کا ہوا پر کم ہے

کمی ایسی ہے کہ جو آنکھ کا دھوکا ہے فقط
اور ، بظاہر جو زیادہ ہے وہ اکثر کم ہے

پھر اُسی طرح ضرورت نہیں ہوتی پوری
کم تھا جو ایک دفعہ ، اب وہ مکرر کم ہے

سوچتے ہیں تو ہے درپیش وہی قحطِ خیال
کھولیے آنکھ تو پھر سامنے منظر کم ہے

مجھے درکار بھی کچھ اتنا زیادہ نہیں تھا
جو میسّر ہے مجھے وہ بھی سراسر کم ہے

گئے دیوانے کہیں ، خاک بھی سب بیٹھ گئی
ایک مدت سے یہ آئینہ مکدر کم ہے

یہ بھی ہوسکتا ہے ساحل سے پلٹ جاؤں، ظفر
اس قدر میرے سفینے کو سمندر کم ہے

☆☆☆

ظفر اقبال

جب اپنی موج میں سوتے ہوئے گزرتا ہوں
تمہارے باغ سے ہوتے ہوئے گزرتا ہوں

جو سوچتا ہوں کسی دل سے پار اُترنے کا
تو اپنی ناؤ ڈبوتے ہوئے گزرتا ہوں

یہ خاک زار گزرگاہ جب مری ٹھہرے
تو کوئی بیج ہی بوتے ہوئے گزرتا ہوں

یہ راستہ ہے مرا روز کا کہ میں اس سے
خود اپنا بوجھ ہی ڈھوتے ہوئے گزرتا ہوں

خود اپنے حال پہ ہنستا ہوں صبح و شام کہ میں
ہر ایک راہ سے روتے ہوئے گزرتا ہوں

مجھے وہاں پہ کوئی بات یاد آتی ہے
جہاں سے آنکھ بھگوتے ہوئے گزرتا ہوں

پھر اس کے بعد مجھے ڈھونڈنا بھی ہے اُس کو
وہ ایک شے جسے کھوتے ہوئے گزرتا ہوں

چمن سے جب بھی گزرتا ہوں سیر کرتے ہوئے
گلوں میں خار چبھوتے ہوئے گزرتا ہوں

ظفر ، مآلِ محبت کی بیل گاڑی میں
میں اپنے آپ کو جوتے ہوئے گزرتا ہوں

ظفر اقبال

کسی سفر سے پلٹتا ہوا گزرتا ہوں
تو اپنی خاک سے اٹا ہوا گزرتا ہوں

میں ایک ہوں، مگر ان خانوں اور حصوں میں
کسی حساب سے بٹتا ہوا گزرتا ہوں

شجر شجر سے مری دوستی ہے، اس لیے میں
تنوں کے ساتھ لپٹتا ہوا گزرتا ہوں

اُجالتا ہوں سبھی راستے محبت کے
اگرچہ دھند ہوں ، چھٹتا ہوا گزرتا ہوں

وہ ایک نقش جو تکرار ہے اِن آنکھوں کی
وہ ایک نام جو رٹتا ہوا گزرتا ہوں

ہے لمحہ لمحہ مری داستان کا ٹکڑا
کہ رات کی طرح کٹتا ہوا گزرتا ہوں

مرے حساب میں گڑبڑ ہے اتنی روز بروز
جو اپنے آپ میں گھٹتا ہوا گزرتا ہوں

ابھی میں پھیلتا جاتا ہوں ابر کی صورت
ابھی یہاں سے سمٹتا ہوا گزرتا ہوں

مرا اخیر تو اب جو بھی ہو سو ہو ، کہ ظفر
بساطِ شعر اُلٹتا ہوا گزرتا ہوں

☆☆☆

ظفر اقبال

میں اپنی چال ہی چلتا ہوا گزرتا ہوں
یہ راستے جو بدلتا ہوا گزرتا ہوں

مجھے جو آب و ہوا راس ہی نہیں تھی کبھی
اُسی میں پھولتا پھلتا ہوا گزرتا ہوں

بہت چڑھا ہوا پانی ہوں اپنے دریا کا
سو ، لہر لہر اُچھلتا ہوا گزرتا ہوں

کبھی میں ڈرتا رہا بھی ہوں دشمنوں سے ، مگر
اب اُس گلی سے ٹہلتا ہوا گزرتا ہوں

کبھی سماتا ہوا ایک شے میں ، اور ، کبھی
کسی طرف سے نکلتا ہوا گزرتا ہوں

کہیں پڑا ہوا ہر ایک شے کو ٹھکراتا
کہیں میں آگ اُگلتا ہوا گزرتا ہوں

جہاں سے چھوڑ گیا ہے کوئی مجھے پیچھے
حسد کی آگ میں جلتا ہوا گزرتا ہوں

گڑھے سے کھودر کھے ہیں جو دوسروں کے لیے
میں اُن سے گرتا سنبھلتا ہوا گزرتا ہوں

بلا ہوں ایک ، ظفر ، اور ، ناگہاں ، لیکن
میں اپنے سر سے بھی ٹلتا ہوا گزرتا ہوں

☆☆☆

ظفر اقبال

ہوا کے ساتھ گزرتا ہوا گزرتا ہوں
جو برگ برگ بکھرتا ہوا گزرتا ہوں

اسی طرف سے مجھے خطرہ ہے اگر کوئی ہے
میں اپنے آپ سے ڈرتا ہوا گزرتا ہوں

ہے ایک ہمہمۂ زندگی مرے درپیش
جو اِس دیار سے مرتا ہوا گزرتا ہوں

میں اپنی شامتِ اعمال بھی نہیں کہ یہاں
کِیا نہیں ہے جو بھرتا ہوا گزرتا ہوں

جہاں سے تیز گزرتا تھا میں کبھی پہلے
وہیں سے رُکتا ٹھہرتا ہوا گزرتا ہوں

ہے کوئی بات جو بتلا رہا ہوں رہ رہ کر
ہے کوئی کام جو کرتا ہوا گزرتا ہوں

بنی نہیں ہے ابھی کوئی میری آخری شکل
ابھی بگڑتا سنورتا ہوا گزرتا ہوں

میں بیٹھ جاؤں گا پھر جھاگ کی طرح یک دم
پھر اک دفعہ جو بپھرتا ہوا گزرتا ہوں

مرے زوال کا موسم ہے زور پر ، سو ، ظفر
بلندیوں سے اُترتا ہوا گزرتا ہوں

☆☆☆

ظفر اقبال

بات سندیسہ تھی اُس کی ، گفتگو پیغام تھا
دُور تھا وہ اور ہمارے روبرو پیغام تھا

جس نے موسم ہی بدل ڈالا تھا میرے ہر طرف
دفعتاً وہ ایک ایسا رنگ و بُو پیغام تھا

اس سے اچھا کوئی موقع اور کیا ہوتا کہ وہ
تشنگی کے دشت میں جام و سبو پیغام تھا

ایک طوفانِ خزاں تھا جن دنوں چاروں طرف
اُس کے اندر ہی کوئی خوابِ نمو پیغام تھا

کاٹ دی اُس کی وضاحت میں ہی ساری زندگی
ایسا پیچیدہ زمانے بھر میں تو پیغام تھا

ایک سنگینی بھی تھی اُس میں کہیں رکھی ہوئی
دیکھنے میں تو کچھ ایسا نرم خو پیغام تھا

یاد ہی رکھا نہ ہم نے ورنہ تو پہلے پہل
کو بہ کُو اس کا سبق تھا ، سو بہ سو پیغام تھا

ہم نہیں سمجھے تو اُس کا بھی بھلا کیا ہے قصور
اک اشارہ سا تھا ، لیکن ہو بہو پیغام تھا

تھا یہی حاصل تگ و تازِ معانی کا ، ظفر
لفظ پیرایہ تھا اپنا ، اور لہو پیغام تھا

☆☆☆

ظفر اقبال

دربدر پیغام تھا یا جا بجا پیغام تھا
دن سا اِک نکلا ہوا تھا جیسے ، کیا پیغام تھا

پھول پتّے بھی پسینے میں تھے جیسے تربتر
میری خاطر چلنے والی اک ہوا پیغام تھا

صرف معنی اور مطلب ہی نہ تھا اُس کا کوئی
ورنہ کہنے کو تو وہ اچھا بھلا پیغام تھا

کوئی سنتا ہی نہ تھا ، اس کو سمجھنا تو بہت
دُور کی تھی بات ، جو میری صدا پیغام تھا

اہلِ دُنیا اپنے اپنے گز لیے پھرتے رہے
بات چھوٹی تھی ، مگر اُس میں بڑا پیغام تھا

سرزنش اُس میں ہمارے نام کی بھی تھی کوئی
دوسروں کے واسطے جو آپ کا پیغام تھا

اک پرانی ہی کوئی تکرار تھی انکار کی
ہم تو سمجھے تھے کہ یہ کوئی نیا پیغام تھا

چل رہا تھا میں ازل سے ، اور ، میرے سامنے
کوئی بھی منزل نہ تھی ، بس راستا پیغام تھا

اس طرح لگتا نہ تھا باہر سے تو ، لیکن ، ظفر
اندر اندر ہی کوئی بندِ قبا پیغام تھا

ظفر اقبال

وہ زمیں پیغام تھا ، یا آسماں پیغام تھا
خود بھی وہ موجود تھا اُس کا جہاں پیغام تھا

راستے تھے فاصلوں کو کاٹ کر چلتے ہوئے
گرد تھی ہر سمت ، کوئی کارواں پیغام تھا

تھے اشارے اور کنائے سے پسِ الفاظ کچھ
شور و شر میں ایک ایسا بے زباں پیغام تھا

جس نے جو بویا تھا اُس نے کاٹنا بھی تھا ضرور
اور ، وہ سب کے لیے سود و زیاں پیغام تھا

اس دفعہ تو یہ لطیفہ بھی رہا تھا میرے ساتھ
میں جہاں سے غیر حاضر تھا وہاں پیغام تھا

سننے والا تھا نہ پہنچانے ہی والا تھا کوئی
ہر طرح اور ہر طرف سے رائگاں پیغام تھا

کچھ مکینوں کو خبر تھی ، اور کچھ تھے بے خبر
وہ مکاں پیغام تھا اور لامکاں پیغام تھا

شام تھی اور ٹوٹتے تھے دم بہ دم تارے ، ظفر
صبح کی بھولی ہوئی اک داستاں پیغام تھا

کیوں بیاں اس میں ظفر کچھ بھی نہیں تھا دُور دُور
کیوں سراسر اس دفعہ طرزِ بیاں پیغام تھا

☆☆☆

ظفر اقبال

کچھ نہیں سمجھا ہوں ، اتنا مختصر پیغام تھا
کیا ہوا تھی جس ہوا کے ہاتھ پر پیغام تھا

اُس کو آنا تھا کہ وہ مجھ کو بلاتا تھا کہیں
رات بھر بارش تھی ، اُس کا رات بھر پیغام تھا

لینے والا ہی کوئی باقی نہیں تھا شہر میں
ورنہ تو اُس شام کوئی دربدر پیغام تھا

منتظر تھی جیسے خود ہی تنکا تنکا آرزو
خار و خس کے واسطے گویا شرر پیغام تھا

کیا مسافر تھے کہ تھے رنجِ سفر سے بے نیاز
آنے جانے کے لیے اک رہ گزر پیغام تھا

کوئی کاغذ ایک میلے سے لفافے میں تھا بند
کھول کر دیکھا تو اُس میں سر بہ سر پیغام تھا

ہر قدم پر راستوں کے رنگ تھے بکھرے ہوئے
چلنے والوں کے لیے اپنا سفر پیغام تھا

کچھ صفت اُس میں پرندوں اور پتّوں کی بھی تھی
کتنی شادابی تھی اور کیسا شجر پیغام تھا

اور تو لایا نہ تھا پیغام ساتھ اپنے ظفر
جو بھی تھا اُس کا یہی عیب و ہُنر پیغام تھا

صابر ظفر

بدن کی روشنی باہر قبا سے دیکھی گئی
مزید یہ کہ مرے آسے پاسے دیکھی گئی

بدن سے کھیلتی دیکھی گئی وہ ریتلی نیند
نجانے اُس کی لگن کس ادا سے دیکھی گئی

بدن ، پناہ میں اُس کی ہمیشہ دیکھا گیا
کہ پور پور وصال و وفا سے دیکھی گئی

یہ انتہائے جمال آج ہی کی بات نہیں
بدن میں اُس کے، کشش ابتدا سے دیکھی گئی

بدن، نہال ہُوا اُس کے رنگ رَس سے ظفر
نوازش اُس کی ، اُسی کی رضا سے دیکھی گئی

صابر ظفر

جہاں میں سو گیا تھا وہ مچان اُس کے بدن کی تھی
کھلی جب آنکھ، دیکھا، کیا اُٹھان اُس کے بدن کی تھی

اگرچہ دخل کچھ میری محبت کی کشش کا تھا
وہ کیفیت ہمیشہ مہربان اُس کے بدن کی تھی

گواہی دے مری چاہت ، بدن تھا بولتا اُس کا
سمجھ میں آنے والی ہر زبان اُس کے بدن کی تھی

کوئی بھی چھُو نہیں سکتا تھا اُس اوجِ محبت کو
مگر میری رسائی تک اُڑان اُس کے بدن کی تھی

تڑپتا ہی رہا شام و سحر اُس سے الگ ہو کر
ظفر میرے بدن میں جیسے جان اُس کے بدن کی تھی

☆☆☆

صابر ظفر

وہ چاندنی جو نہاتی تھی رات پانی میں
فقط تھی رات بھر اُس کی حیات پانی میں

ڈبو دیا اِسی پانی نے میرا لختِ جگر
اگرچہ ماہی کی ہے ، کائنات پانی میں

اُچھالوں لہر تو سمجھے کوئی مرا مطلب
اگرچہ ہو نہیں سکتی ہے بات پانی میں

مگر یہ ساتھ کوئی عمر بھر کا ساتھ نہیں
اگرچہ تیرتا ہے میرے ساتھ پانی میں

مگر یہ ربط کوئی عمر بھر کا ربط نہیں
اگرچہ تھام بھی لیتا ہے ہاتھ پانی میں

صابر ظفر

وہ چاند پھر اُسی تالاب میں نظر آیا
کہ خواب تھا جو مجھے خواب میں نظر آیا

دمِ وصال جو مضموں تھا اُس کی آنکھوں میں
کتاب کے نہ کسی باب میں نظر آیا

اُتر چکا جو میں روح و بدن میں اُس کے تو وہ
مرے لہو کی تب و تاب میں نظر آیا

کسی بھی شکل میں واضح نظر نہ آیا مجھے
سراب میں وہ کبھی آب میں نظر آیا

بس ایک بار ہی دیکھا تھا میں نے اُس کو ظفر
وہ پھر نہ حلقۂ احباب میں نظر آیا

☆☆☆

صابر ظفر

اگر خیال میں تشکیک اور تضاد نہ ہو
تو کیا محال ہے ، افسردہ روح ، شاد نہ ہو

نکل سکے کوئی تجدیدِ عہد کی صورت
دلاؤں یاد اُسے ، شاید اُس کو یاد نہ ہو

میں اس جگہ سے بھی اب کوچ کرنا چاہتا ہوں
کہ جیسے یہ بھی مری منزلِ مراد نہ ہو

زیادہ دیر میں صحرا میں رہ نہیں سکتا
اگر یہاں کوئی تصویرِ ابر و باد نہ ہو

رقیب لگتے ہیں پھر دشت میں بگولے بھی
ظفر جب اپنی محبت پہ اعتماد نہ ہو

صابر ظفر

پلٹ کے پھر کسی صحرا کی سمت چلتے ہیں
کہ ہم تو قیس ہیں ، لیلیٰ کی سمت چلتے ہیں

یقین کرتے ہوئے اُس نظر کی باتوں کا
ہم ایک وعدۂ فردا کی سمت چلتے ہیں

جو ساتھ لے کے چلے اور نہ واپس آنے دے
اُس ایک نقشِ کفِ پا کی سمت چلتے ہیں

یہ پانیوں پہ چراغ اور راستوں پہ سراب
لگے کہ چشمِ تماشا کی سمت چلتے ہیں

ہم ایک جھوک کی جانب رواں دواں ہیں ظفر
وہ اور ہوں گے جو دُنیا کی سمت چلتے ہیں

☆☆☆

صابر ظفر

بدن نہاتا ہوا چاندنی میں دیکھا گیا
یہ معرفت کا عمل بندگی میں دیکھا گیا

جو مہر و ماہ محبت غروب ہوتے نہیں
اُنہیں ہمیشہ تری دلبری میں دیکھا گیا

نثار ہوتے گئے تیرے دیکھنے والے
شکوہِ حُسن تری سادگی میں دیکھا گیا

کسی کو جاتے جو دیکھا گیا خدا کی طرف
تو آخرت کا سفر زندگی میں دیکھا گیا

گواہی دے وہ نظر، بے نیاز لعل و گہر
ہمیشہ غرق ظفؔر شاعری میں دیکھا گیا

صابر ظفر

میں اُس کے بعد اُسی کے نشے میں زندہ رہا
کہ اُس کے در پہ نہیں، راستے میں زندہ رہا

وگرنہ کون ترے بعد جینا چاہتا ہے
مجھے لگا میں لگن کے صلے میں زندہ رہا

نہ کوئی راہ نما ہے کہ جو کرے ماتم
نہ کوئی راہی کسی قافلے میں زندہ رہا

رہا نہ تخت ہزارہ نہ رنگ پُور لیکن
مقامِ عشق میرے راجھڑے میں زندہ رہا

وہ ہر کہیں ہے ظفؔر اور میں کہیں بھی نہیں
وہ میرا عکس تھا جو آئینے میں زندہ رہا

☆☆☆

صابر ظفر

عجب نقہ رہا تھا رات اُس کی گرم جوشی سے
نمایاں تھے میرے جذبات اُس کی گرم جوشی سے

نوازش تھی یہ پہلی بار، آغاز زمستاں میں
حرارت پا گئے تھے ہاتھ اُس کی گرم جوشی سے

قریب آتے ہی اُس کے ہو گیا تبدیل یوں موسم
ہوئی بوسوں بھری برسات اُس کی گرم جوشی سے

نہ تھے الفاظ میرے پاس اُس کی مدح کرنے کو
مگر جاری رہی وہ بات اُس کی گرم جوشی سے

میں اُس کو دیکھتا تھا اور ظفؔر پیہم ترستا تھا
بہت سُندر ہوئے حالات اُس کی گرم جوشی سے

صابر ظفر

میں چاہتا ہوں کہ اُس رات کی گواہی دے
کہاں ملے تھے، ملاقات کی گواہی دے

اگر یقین ہے تجھ کو مری محبت کا
مرے وجود، مری ذات کی گواہی دے

ہر ایک رنگ میں تُو ہے، ہر انگ میں تُو
میں حق پہ ہوں تو مری بات کی گواہی دے

ترے نصیب میں ہوں میں، مرے نصیب میں تُو
کہیں لکیریں مرے ہاتھ کی، گواہی دے

وہ میں ہی تھا کہ جو تیرے لیے فسردہ تھا
وہی ہوں میں، مرے حالات کی گواہی دے

میں نفی کرتا چلا جا رہا ہوں اپنی ظفؔر
کہاں ہے تُو، مرے اثبات کی گواہی دے

☆☆☆

قاضی حبیب الرحمٰن

کچھ تو ہے دل جسے چھپائے
کیوں ورنہ زبان لڑکھڑائے

اِک عُمر سے یاد آ رہا ہے
اِک عُمر ہوئی جسے بھلائے

شاید وہ غزال اِدھر سے گزرے
آنکھوں نے رتجگے بچھائے

آیا وہ رات ، یوں اچانک
بے ساختہ جیسے نیند آئے

کس کس کی زبان کاٹیے گا
ہر شخص کی اپنی اپنی رائے

کس زعم میں ہے غمِ زمانہ
ہمت ہے تو رُوٹھ کر دکھائے

ہر شام ، نئے سفر کا آغاز
ہر گام ، خیالِ ڈگمگائے

ہر لحظہ ، بدل رہا ہے موسم
ہر لحظہ ، وہ آنکھ گُل کھلائے

شوخی تو ملاحظہ ہو ، وہ شوخ
آئینے کو آئنہ دکھائے

اسرارِ حیات کھُل رہے ہیں
جوں جوں وہ یار کھُلتا جائے

وہ یاد ، کہ بھول جائے ہر بات
وہ جسم ، کہ روح گنگنائے

کچھ رنگ بکھر گئے فضا میں
کچھ خواب ، نظر میں لہلہائے

آسیب ہے یا حبیبؔ کیا ہے
لَو دیتے ہیں ساری رات سائے

☆☆☆

خاورؔ اعجاز

غارِ حرا میں صبح ہوئی ، شام طُور پر
اُس کو بھی پھِر رہا نہ کوئی کام طُور پر

اب گامزن ہے راہِ مدینہ پہ زندگی
چلنے کو تو چلی تھی وہ دوگام طُور پر

روشن ہوئے ہیں ایک ہی نُورِ قدیم سے
اِک نام جبلِ رحمہ پہ اِک نام طُور پر

بھڑکی تھی جو کہ خواہشِ دیدارِ یار میں
اُس آگ نے کیا نہیں آرام طُور پر

شاید تمہیں خبر ہو کہ تکمیلِ دیں سے قبل
اُترا تھا ایک پیشگی پیغام طُور پر

اُٹھتا ہے روز وادیِ سینا سے جب دھواں
مچتا نہیں ہے کیوں کوئی کہرام طُور پر

خاموش ہیں برستی ہوئی آگ میں بھی ہم
منہ کھول دیں تو آتا ہے الزام طُور پر

خاورؔ اعجاز

یہ سمجھو مہربانی کر رہے ہیں
ابھی شکوہ زبانی کر رہے ہیں

تمہارے واسطے ارضِ تمنّا
ہم اپنا خون پانی کر رہے ہیں

نتیجہ کچھ نہیں بس داستاں گو
وہی قصّہ کہانی کر رہے ہیں

ہمارے ہاتھ میں بس اِس قدر ہے
نئی دُنیا پرانی کر رہے ہیں

دیے روشن تو ہیں پر یوں کہ جیسے
ہوا کی ترجمانی کر رہے ہیں

یہ کیا کم ہے ، ترے مامور بندے
زمینیں ، آسمانی کر رہے ہیں

بہت اُکتا چکے ہیں تجھ سے دُنیا!
سو اَب نقلِ مکانی کر رہے ہیں

☆☆☆

خاورؔ اعجاز

موسمِ گل تو فقط عارض و لب لاتا ہے
وہ کوئی اور ہے جو باغ کو دہکاتا ہے

ہے اندھیرے میں جو خوبی وہ اُجالے میں نہیں
جس کا بھی دھیان کریں سامنے آ جاتا ہے

میں کسی سیلِ رواں کی طرح ہر وقت میں ہوں
اِک زمانہ مرے ہمراہ چلا جاتا ہے

شک کی بنیاد پہ جو پھیل گیا ہو دِل میں
زندگی بھر وہ دھواں کم نہیں ہو پاتا ہے

یوں تو پتھر کی طرح رہتا ہے ساکن لیکن
سوچ بدلیں تو زمانہ بھی بدل جاتا ہے

خاورؔ اعجاز

جو آ رہی تھی چمن پر گھڑی وہ آ کے رہی
ہوا بہار کی گلشن میں گل کِھلا کے رہی

دیے کی لَو سے اُلجھتی رہی مگر آخر
ہوائے شہرِ ستم گر دِیا بجھا کے رہی

شجر بھی کاٹ دیے تھے عدو نے جس گھر کے
کلی بھی اُس کی زمانے میں سر اُٹھا کے رہی

ہماری بات تھی مبنی خلوصِ نیّت پر
سو اُس کے دل میں خود اپنی جگہ بنا کے رہی

بہت دنوں رہی مغموم ، پر یہ دل کی کلی
وفورِ غم میں بھی اِک روز مسکرا کے رہی

☆☆☆

خاورؔ اعجاز

زمینِ آرزو جل تھل نہیں ہے
کہیں دریا کہیں بادل نہیں ہے

یہاں کوئی نہیں قانون وانون
یہاں یہ شہر ہے جنگل نہیں ہے

محبت ایک راحت ہے اگرچہ
یہ دنیا آج ہے اور کل نہیں ہے

زمانے سانس ہم میں لے رہے ہیں
ہماری عمر پل دو پل نہیں ہے

کئی اِمکان ہیں تجھ میں مگر تُو
ہمارے مسئلے کا حل نہیں ہے

خاورؔ اعجاز

امیرِ شہر کے دامن سے جو دربار پر آیا
وہی دھبّہ غریبِ شہر کے کردار پر آیا

چراغوں کے تلے پھیلا ہوا اِک ملگجا منظر
تعجب خیز تھا جب شہر کی دیوار پر آیا

ہمیں بھی شوق تھا گلیوں میں ننگے پاؤں چلنے کا
ہمارا پاؤں بھی بجلی کی ننگی تار پر آیا

وہ تیرا رنگ ہوگا جو مری آنکھوں میں جھلکا تھا
وہ میرا زخم ہوگا جو تری تلوار پر آیا

زمانے کی ہوا سے ہم اُلجھنا چاہتے تھے پر
ہوا کا ہاتھ سیدھا جُبّہ و دستار پر آیا

☆☆☆

حفیظ شاہدؔ

کچھ ایسے ہم مسافت میں مگن ہیں
خلافِ راہِ منزل گامزن ہیں

چمن اب وہ چمن لگتا نہیں ہے
وہی گُل ہے ، وہی سرو و سَمَن ہیں

یہ چلتے پھرتے لاشے راستوں میں
نہ جانے کب سے بے گوروکفن ہیں

نہ جانے کس لیے اب تک دریدہ
ہماری زندگی کے پیرہن ہیں

پتنگے تو بس اتنا جانتے ہیں
چراغِ انجمن ہی انجمن ہیں

وہی بے رونقی دیوار و دَر کی
وہی بستی کے آثارِ کُہن ہیں

ہمارے دل کی دُنیا میں بھی شاہدؔ
شگفتہ آرزوؤں کے چمن ہیں

حفیظ شاہدؔ

ہر ایک اہلِ زباں کو کہاں میسّر ہے
ہمیں جو دولتِ لفظ و بیاں میسّر ہے

بھٹک رہا ہوں سرِ دشتِ گمرہی اب تک
نہ راہبر نہ کوئی کارواں میسّر ہے

غموں کی دھوپ سے اُس کو گزند کیا پہنچے
تری دُعا کا جسے سائباں میسّر ہے

ابھی نہیں ہمیں فکرِ تمازتِ ہجراں
ابھی تو سایۂ زُلفِ بُتاں میسّر ہے

مری زمیں کی بھلا ہمسری کہاں ممکن
مری زمیں کو ترا آسماں میسّر ہے

جُدا جُدا ہے یہاں ہر مکین کی قسمت
تجھے مکان ، مجھے لا مکاں میسّر ہے

یہ اُس کے شہرِ محبت کی ہے عطا شاہدؔ
دلوں کو درد ، لبوں کو فغاں میسّر ہے

☆☆☆

سہیل غازی پوری

سیکڑوں مثالیں ہیں ایسے خاندانوں کی
جو چھتیں گراتے ہیں اپنے ہی مکانوں کی

یہ کبھی جو ہاتھ آئیں پھینک دو سمندر میں
آدمی کو ڈستی ہیں چابیاں خزانوں کی

بے حسی کا عالم بھی ، کیا عجیب عالم ہے
سُن کے بیٹھے رہتے ہیں، ہم صدا اذانوں کی

ابتدا بھی ویسی ہی ، انتہا بھی ویسی ہی
ایک سی کہانی ہے ، ساری داستانوں کی

کاسۂ گدائی کا پیٹ جب نہیں بھرتا
ساکھ بھی تو جاتی ہے کچھ بڑے گھرانوں کی

تتلیوں کو رنگوں میں، خوشبوؤں کو زلفوں میں
یاد بھی نہیں آتی ، پھول کے ٹھکانوں کی

پیڑ پر تھکے ہارے کچھ پرند بیٹھے ہیں
سیر کر کے لوٹے ہیں نیلے آسمانوں کی

حرف ہی سے شاعر کو لوگ یاد رکھتے ہیں
شمع ہی سے ہوتی ہے قدر شمع دانوں کی

یہ زبانِ اُردو ہے کیوں نہ شہد جیسی ہو
چاشنی جب اس میں ہے ان گنت زبانوں کی

کچھ پرند ایسے بھی ہیں سہیلؔ دنیا میں
فکر جو نہیں رکھتے اپنے آشیانوں کی

سہیل غازی پوری

سمندِ لفظِ ہنر سوئے شہرِ شہرت موڑ
جو یہ نہیں تو مرے یار حسبِ عادت موڑ

جہاں سے اپنے فقیروں کے راستے ہیں الگ
کمال ہے اُسے کہتے ہیں لوگ ''دولت موڑ''

کتابِ عشق میں کیا کام ایسے منظر کا
مٹا دے لفظ انا ، صفحۂ عداوت موڑ

جدھر سے آتی ہے دشنام کی عجب آواز
کبھی تو تُو بھی اُدھر آلۂ سماعت موڑ

ہے سامنے مرا ہم زاد اور یہ کہتا ہے
جو مُڑ سکے تو ذرا پنجۂ بغاوت موڑ

خدائے پاک تجھے واسطہ محمدؐ کا
ہر ایک شہر سے اب سوئے دشت دہشت موڑ

تجھے جو چاہیے صبروسکون کی دولت
تو سوئے بام وفا زینۂ ضرورت موڑ

برس چکا ہے سمندر پہ اے مرے مولا!
زمینِ خشک کی جانب بھی ابرِ رحمت موڑ

کوئی سمجھ نہ سکے خیر سے سہیلؔ اس کو
جو موڑنا ہے تو یوں بیچ سے حکایت موڑ

مشتاق شبنم

رفاقتوں میں کوئی رنگ بھر نہیں پائے
وہ آئینہ تھا مگر ہم سنور نہیں پائے

نہ امن و صلح کا گہوارہ بن سکی یہ زمیں
جو کام کرنا تھا ہم کو وہ کر نہیں پائے

زمیں سے تا بہ فلک ہے فشارِ تیرہ شبی
اُفق سے صبح کے سورج اُبھر نہیں پائے

بکھر رہے ہیں مسائل کی تیز دھار پہ ہم
یہ پل صراط تھی ایسی گزر نہیں پائے

شکار ہو گئے جو مصلحت کی سازش کا
صداقتوں کا وہ اظہار کر نہیں پائے

جنہیں حیات کی حسرت تھی مر گئے وہ لوگ
جو چاہتے تھے کہ مر جائیں مر نہیں پائے

نہ مجھ سے پوچھئے انجام ان کا اے شبنم
بلندیوں سے جو اپنی اُتر نہیں پائے

☆☆☆

مشتاق شبنم

رمزِ مرگ و زیست منجملہ بنا دیتا ہوں میں
خاک مٹھی بھر اُٹھاتا ہوں اُڑا دیتا ہوں میں

دورِ بے چہرہ کو اِک چہرہ بنا دیتا ہوں میں
یعنی کردار و عمل کا آئینہ دیتا ہوں میں

ظلم پرور سوچ کو اک زاویہ دیتا ہوں میں
جب ستم ہوتا ہے مجھ پر مسکرا دیتا ہوں میں

جانے کس ردِعمل کا سامنا کرنا پڑے
اس کی بینائی کو اپنا آئینہ دیتا ہوں میں

دوست دشمن کی نہیں تخصیص کارِ خیر میں
شاہراہِ عام سے پتھر ہٹا دیتا ہوں میں

زندگی تو خود بخود کرتی ہے خود کو آشکار
حرف سے قرطاس پر چہرہ بنا دیتا ہوں میں

پوچھتا ہے جب بھی حالِ دل کوئی شبنم تو پھر
مسکرا کر اپنے زخموں کو چھپا دیتا ہوں میں

گفتار خیالی

اپنی ہر خواہش مجھے مسمار کر دینا پڑی
جیت بھی مجبوریوں میں ہار کر دینا پڑی

میرے ہر جانب سے یوں اُمڈے چلے آئے غنیم
فوج ساری برسرِ پیکار کر دینا پڑی

دیدۂ حرص و ہوس ہر سمت تھا چشمک کناں
گھر کی اونچی اس لیے دیوار کر دینا پڑی

بوالہوس آنکھوں سے بچنا اس قدر دشوار تھا
پتّی پتّی ہر کلی کی خار کر دینا پڑی

زخم کاری تھے بہت جن کے تدارک کے لیے
پارہ پارہ اپنی ہی دستار کر دینا پڑی

زندگی میں زندگی کرنا بڑا دشوار تھا
صبر کی حد بھی تھی جتنی پار کر دینا پڑی

ایک کوشش سے اُٹھے گفتار کتنے مسئلے
پہلی ہر کوشش مجھے بیکار کر دینا پڑی

☆☆☆

گفتار خیالی

ہوائیں سو رہی ہیں اور سمندر جاگتا ہے
انوکھا خوف ہے جو دل کے اندر جاگتا ہے

ابھی کچھ دیر اپنے گھر کے دروازے نہ کھولو
تعاقب میں مرے دشمن برابر جاگتا ہے

وہ نرغے میں بھی ہے، لیکن وہ دشمن پُرسکوں ہے
وہ غالب ہے جو لے کر اپنا لشکر جاگتا ہے

مری تصویر کے سب نقش گویا کھو گئے ہیں
کفِ تصویر میں میرا مقدر جاگتا ہے

نگاہیں کھو بھی جاتی ہیں تو منظر جاگتا ہے
مگر ہر اک روش پر ایک محشر جاگتا ہے

مری خوابیدگی بہتر ہے میرے جاگنے سے
کہ پس منظر میں اک طوفان دَر دَر جاگتا ہے

پرویز ساحؔر

ہر وقت اپنے پیار کی یلغار کر رکھوں
مجھ دسترس میں ہو تو اُسے مار کر رکھوں

خود بھی تمام رات میں جاگوں ، اِسی طرح
اور اپنے ساتھ اُس کو بھی بیدار کر رکھوں

جی چاہتا ہے ، اُن لب و رُخسارِ یار پر
میں بوسہ ہائے شوق کی بھرمار کر رکھوں

افسوس میرے بس میں نہیں ہے، وگرنہ میں
اِس وقت کو خود اپنا گرفتار کر رکھوں

آخر میں کیوں کر ایک ہی تصویر عمر بھر
خود اپنے گھر میں زینتِ دیوار کر رکھوں

کیا جانیے ، اُدھر سے جواب آئے کس گھڑی
خط ایک اور لکھ کے میں تیّار کر رکھوں

دے حوصلہ مجھے تُو اے میرے خدا ! کہ میں
اِس پُل صراطِ زیست کو خود پار کر رکھوں

کچھ اِس لیے بھی چلتا ہوں میں خود سے تیز تر
تا ، سب کو اپنا رفیقِ رفتار کر رکھوں

اِس خود اذیّتی میں کہیں یوں نہ ہو کہ میں
زخموں سے اپنے سینے کو گُل زار کر رکھوں

مجھ کو میسّر آئے اگر ناخُنِ جنوں
میں خود ہی اپنا دامنِ دل تار کر رکھوں

ایسا نہ ہو کہ وقت یہ مہلت نہ دے مجھے
میں اپنے ہر گناہ کا اقرار کر رکھوں

قبل اِس کے کوئی اور مجھے رَد کرے یہاں
میں خود ہی اپنی ذات سے انکار کر رکھوں

لازم ہوا کہ جابر و ظالم کے سامنے
اِس تیشۂ قلم کو میں ہتھیار کر رکھوں

اِک چارہ گر نے آج مجھے مشورہ دیا
میں خود ہی چارۂ دلِ بیمار کر رکھوں

ساحؔر کوئی نہیں جو مرا ہم مزاج ہو
آخر میں کِس کو مُونِس و غم خوار کر رکھوں

☆☆☆

کاشف مجید

(ظفر اقبال کی زمین میں)

تجھے خبر ہی نہیں تُو نے کیا کیا ہوا ہے
بہت کچھ آشکارا کرنے والا ہوں

وہ حشر ہے جسے تُو نے بپا کیا ہوا ہے
کسی جانب اشارا کرنے والا ہوں

کئی زمانے نکالوں گا اِس کے بل پر میں
یہ ناممکن ہے، آنکھیں ساتھ دے پائیں

ذرا سا عشق جو اُس نے عطا کیا ہوا ہے
میں اِک ایسا نظارا کرنے والا ہوں

خطا نہ کرتا ، تو ہوتا میں آج چاروں طرف
تو پھر یہ زندگانی کون جھیلے گا

وہ اِک نشانہ جو میں نے خطا کیا ہوا ہے
اگر میں بھی کنارا کرنے والا ہوں

میں آگے کس کو کروں گا خدا ، نہیں معلوم
محبت کا ذرا سا کام بھی کافی

ابھی تلک تو خدا کو خدا کیا ہوا ہے
پر میں سارے کا سارا کرنے والا ہوں

ہُوا ہی کرتی ہے بے دست و پا، بجھی ہوئی آگ
جسے کر کے نہیں ڈالا تھا دریا میں

دہکتی آگ کو بے دست و پا کیا ہوا ہے
وہی نیکی دوبارا کرنے والا ہوں

☆☆☆

کاشف مجید

اوصاف نقوی

شعر کہنے کا ہنر ہے گفتگو
حرف ریزوں کا سفر ہے گفتگو

کل انا الحق کی صدا تھی کُو بہ کُو
آج ہر سو دار پر ہے گفتگو

اس کے سارے لفظ ہوں گے کیمیا
جس کی آنکھوں کی نظر ہے گفتگو

ہیں زبانیں صدق سے نا آشنا
اب تو دل کی معتبر ہے گفتگو

شہر کا احساس زنگ آلود ہے
آنسوؤں کی بے اثر ہے گفتگو

خامشی سے شخصیت مجوب ہے
شخص کے عرفاں کا در ہے گفتگو

پرورش اوصافؔ پائے ذہن میں
سوچ کی اک رہ گزر ہے گفتگو

☆☆☆

اوصاف نقوی

سب لبوں پر گنگناتی آج یہ گفتار ہے
خون کی گرمی فقط انسان کا کردار ہے

سوچ بھی بالغ ہوئی ہے جیب بھی اپنی تہی
خواہشوں کا جس طرف بھی دیکھئے بازار ہے

پتھروں کے شہر میں کیسے جئیں اہلِ قلم
شاعروں کے واسطے اک سانس بھی اک دار ہے

آنکھ اپنے حُسن کے جلوے سے ہے یکسر تہی
اس جہاں میں اپنا ملنا ہی بہت دشوار ہے

نیند کی آغوش سے جاگی کہاں سوچیں تری
ذہنِ انسانی ابھی پورا کہاں بیدار ہے

درد ہے نہ حُسن ہے اوصافؔ ان اشعار میں
آج کل کی شاعری الفاظ کا پندار ہے

عابد خورشید

لمحے کی طرح ، خود کو نہ یوں بے کنار کر
اے شام ، ذرا تو بھی مرا انتظار کر

سورج سے چھین پگھلی ہوئی دھوپ کا نشہ
با اختیار کو کبھی بے اختیار کر

دستک ترے وجود سے خالی ہے اِک جہان
آواز دے کے اِس کو نہ اِنتشار کر

کب تک شباہتوں میں اُسے ڈھونڈتے پھریں
جو چھپ گیا فلک کو زمیں پر اُتار کر

اپنے وجود سے لگی کرنوں کو جھاڑ دے
جو شب کدے میں رہ گئے سایے ، شمار کر

سر سے سرک نہ جائے کہیں دوپہر کی دھوپ
خواہش کا لمس میرے بدن میں اُتار کر

عابد خورشید

سورج کی طرح صبح کے زینے پہ کھڑا ہے
وہ شخص ، شعاعوں کے سمندر سے بڑا ہے

کس کس کے لیے اَب رگِ نیت کو اُبھاروں
اِک لمحہ چناؤ کا اگر آن پڑا ہے

بیدار نہ ہو ساعتِ بیدار سے پہلے
یہ وقت مشیت کی اَنی لے کے کھڑا ہے

پانی پہ اُبھر آئی ہیں برہم سی لکیریں
جھونکا کوئی خوشبو کا ہواؤں سے لڑا ہے

گزرے ہوئے لمحے نے کہا مجھ سے پلٹ کر
تو اُس کے خیالوں میں یہاں کب سے کھڑا ہے

لہروں کی مسافت کے لیے چاہیے خورشیدؔ
موتی کی طرح آنکھ میں وہ عکس جڑا ہے

☆☆☆

رومانہ رومی

اک تو میرا دل بے تاب
اُس پر ڈستا ہے مہتاب

کتنے موسم بیت چکے ہیں
کتنے ہم نے دیکھے خواب

جانے کیا دکھلائے رنگ
میری آنکھوں کا سیلاب

حال ہمارا پوچھ رہے ہیں
کتنے بھولے ہیں احباب

دل کی بات بتاؤں کس کو
بند ہے اب اُلفت کا باب

غم کا ایک سمندر رومؔی
چاروں طرف جس کے گرداب

☆☆☆

رومانہ رومی

فروغِ زندگی سے ڈر رہی ہوں
یہ کیوں میں روشنی سے ڈر رہی ہوں

گریزاں تم بھی ہو دانشوروں سے
تو میں بھی آگہی سے ڈر رہی ہوں

بہت کم ظرف ہے دنیا فریبی
میں اپنی سادگی سے ڈر رہی ہوں

چراغوں سے بھی گھر جلتے ہیں اکثر
زیادہ روشنی سے ڈر رہی ہوں

کوئی طوفان اُٹھ جائے نہ رومؔی
میں اپنی خامشی سے ڈر رہی ہوں

گفتار خیالی

فسونِ گردشِ ایّام ہے

فسونِ گردشِ ایّام یہ ہے
کہ جیسے گرم گرم ہو ہو کر ہوائیں
زمیں سے رفعتوں کی سمت دوڑیں
اور اس کے بعد پھر ٹھنڈی ہوائیں
تعاقب میں چلیں پہلی ہوا کے
ازل سے چل رہا ہے یونہی چکر
پرانے دَور کی اقدار کہنہ
نئی تہذیب کے مرگھٹ میں جل کر
خود اپنی راکھ کا گارا بنائے
نئے اقدار کی تاسیس گر ہے
فسونِ گردشِ ایّام ہے
کہ ماں کی کوکھ سے قصرِ لحد تک
ہر انساں درد جھیلے مسکرائے
فضا میں روشنی کا باب لکھے
شبِ تیرہ کو روشن خواب لکھے
کہ نسلِ نو کی چشم وا پہ افشاء
فسونِ گردشِ ایّام یوں ہو
یہ رنگ و رامش تقدیرِ فطرت
کبھی بھی کم نہ ہو بلکہ فزوں ہو

☆☆☆

مشتاق شبنم

اضطراب

زمیں پر بھی وہ دسترس چاہتا ہے
فلک پر بھی وہ دسترس چاہتا ہے
خلائق کی تسخیر کا ادعائی تصور لیے
جست در جست اقدام کرتا ہوا
فتح و نصرت کا ڈنکا بجاتا ہوا
ہر طرف اپنا سکّہ بٹھاتا ہوا
زعمِ طاقت کی شہ پر اُڑا جا رہا ہے
روایت، رعایت، رواداریوں اور
تہذیب کی آگہی سے گریزاں
فقط خواب و خواہش کا فرماں روا
ابرہہ کی طرح
بڑھ رہا ہے مگر
وہ نہیں جانتا کہ ابابیل بھی
اپنے پنجوں میں کنکر دبائے ہوئے
فضاؤں میں ہیں
مضطرب حکم کی منتظر!

☆☆☆

مبشر مہدی

زَرد آسماں

(۱۰؍اور ۱۱؍جولائی ۲۰۰۶ء کی درمیانی شب)

آسماں زرد ہے آج
وہ زرد کہ ہے جس میں اِک نیل رواں
نیل کہ جہاں دہکتی ہوئی آگ
دہکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں لپک
وہ
خاکستر بنیں جس میں
نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھیں
تھی جن کو نہ خبر اس کے سوا
جاگتے رہنا ہے یا پرونے ہیں کوئی خواب
خواب جن کی تعبیر میں سوزش تھی ازل کی

روشِ روشنی گم
لکھتی ہے صریرِ دیدۂ حیراں
نوحہ کناں شہر بہ شہر
بے رِدا کم سن چاند کی مسکاں
موت ہے رقص (کناں) فشاں
زندگی بجھتے ہوئے سورج کی ادا
آمدِ موسمِ بے چارگی جاں
گُو بہ گُو غم کی سیاہی کے نشاں
مقتلِ عشق میں یہ شورشِ چارہ گراں
آخری باب کی تکمیل کی سمت رواں

ٹھہر اے آتشِ دل!
چل اے زخمِ اندوہِ وفا
ٹھہر اے انگڑائی لیتی زمیں میں اُترتی ہوئی چپ
چند عشّاق کے سائے آتے ہیں ابھی
تری خاک پہ ثبت کرنے کو یہ
اک نیا گلدستۂ جاں

☆☆☆

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

ماہِ جون ۲۰۰۶ء کے انگارے میں ایم خالد فیاض صاحب کا مضمون ''منٹو کا ایک فراموش شدہ افسانہ'' پڑھا اور یہ احساس ہوا کہ گم گشتہ چیزوں کی بازیابی خوشی کے ایسے احساس سے سرشار کر دیتی ہے کہ ہم کبھی کبھی اہم باتوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ میں فیاض صاحب کی توجہ چند باتوں کی جانب دلانا چاہوں گی جو بہت ممکن ہے فیاض صاحب اور قارئین کے نزدیک بہت اہم نہ ہوں لیکن ریکارڈ کی درستگی کے لیے اہم ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ منٹو کا فراموش شدہ افسانہ تو قطعی نہیں ہے۔ یوں محققین سے کبھی کبھی چوک ہو جاتی ہے جیسے ان سے ہوگئی ہے کہ یہ افسانہ پہلی مرتبہ ساقی کے جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء میں نہیں ماہنامہ ادبِ لطیف، لاہور، ماہ اپریل ۱۹۵۴ء، جلد ۳۷، شمارہ ۶ میں صفحہ نمبر ۴۳ پر میرزا ادیب مرحوم کی زیرِ ادارت طبع ہوا۔ اس شمارے میں صرف دو ہی افسانے شائع ہوئے تھے۔ ایک منٹو کا ''پھوجا حرام دا'' اور دوسرا امین الرحمٰن کا ''بادِ خزاں میں ملا ہوا اس کا غم''۔ جن دنوں میں ماہنامہ ادبِ لطیف پر کام کر رہی تھی ان دنوں میں نے یہ پرچہ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور میں نہ صرف دیکھا اور پڑھا تھا بلکہ دیگر پرچوں کے ساتھ وہاں سے اس پرچے کے کچھ صفحات کی فوٹو کاپی بھی حاصل کی تھی۔ اسی لیے میں وثوق سے یہ بات کہہ رہی ہوں کہ یہ افسانہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء اپریل کے ادبِ لطیف میں شائع ہوا تھا۔ البتہ آپ کی نشان دہی کے بعد میں نے پبلک لائبریری، لاہور سے یہ پرچہ دوبارہ دیکھنا چاہا تو معلوم ہوا کہ منٹو کے کسی شیدائی نے شاید اس فراموش شدہ افسانے کی خاطر یہ پرچہ ہی لائبریری سے غائب کر دیا ہے کیونکہ اب وہاں آپ کو ۱۹۵۴ء کے ادبِ لطیف کے دیگر شمارے تو مل جائیں گے لیکن بس ایک یہی اپریل ۵۴ء کا شمارہ نہیں ملے گا۔

یوں ہی معلومات کے لیے یہ جان لیجیے کہ اس شمارے میں مذکورہ دونوں افسانوں کے علاوہ ظ۔ انصاری کا تنقیدی مضمون ''جدید ادب کے جدید تر سوال''، غلام ربانی تاباں، حنیف فوق، باقی صدیقی اور سلیم واحد سلیم کی نظمیں، ڈاکٹر مسعود حسین، احمد ریاض، رفعت سلطان اور حسن بخت کی غزلیں، یوسف الشاروئی کا مترجم افسانہ ''چھٹے مالے پر چوری'' (مترجم ضیا الحسن موسوی) اور بہت کچھ متفرقات کی ذیل میں شائع ہوا تھا۔ ان دنوں اس پرچے میں قارئین کے خطوط طبع نہ ہو رہے تھے وگرنہ ایک آدھ شہادت مئی جون کے پرچوں سے بھی مل جاتی۔

فیاض صاحب نے اپنے مضمون کا آغاز اس بات سے کیا ہے کہ کسی محقق نے اس افسانے کا حوالہ نہیں دیا۔ تو صاحب میں نے اپنے مقالے میں حوالہ دیا ہے (اور یہ مقالہ اب کتابی شکل میں طبع ہو گیا ہے۔)

فیاض صاحب کا کہنا ہے کہ ''ساقی کے مالک اور ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی تھے۔ منٹو کے افسانے ''دھواں'' اور ''کالی شلوار'' بھی ساقی ہی میں شائع ہوئے تھے اور جب ان افسانوں پر مقدمہ چلایا گیا تو شاہد احمد دہلوی پر ان افسانوں کو شائع کرنے کی فردِ جرم عائد کی گئی۔ لہٰذا مقدمے میں منٹو کے ساتھ ساتھ انہیں بھی دھر لیا گیا تھا۔'' ممکن ہے ''دھواں'' ساقی میں شائع ہوا ہو اور اس پر مدیر ساقی کو مقدمے کا سامنا بھی کرنا پڑا ہو لیکن مقدمات کی زَد میں آنے والے منٹو کے معروف افسانے ''کالی شلوار'' اور ''بُو'' ادبِ لطیف میں شائع ہوئے تھے۔ جنوری ۱۹۴۲ء (جلد اور شمارہ نمبر نہیں دیا گیا) کے ادبِ لطیف میں فیض احمد فیض کی زیرِ ادارت غلام عباس کے ''آنندی''، کرشن چندر کے ''پرانے خدا''، احمد علی کے ''مارچ کی ایک رات''، دیوندر ستیارتھی کے ''نئے دیوتا'' کے ساتھ منٹو کا ''کالی شلوار'' اور عصمت چغتائی کا ''لحاف'' طبع ہوا۔ ''کالی شلوار'' اور ''لحاف'' کی طباعت پر ادبِ لطیف کو عدالت اور جرمانے کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح احمد ندیم قاسمی کی زیرِ ادارت ادبِ لطیف دسمبر جنوری ۴۴-۴۳ء، جلد ۱۸، شمارہ ۵-۴ میں منٹو کا افسانہ ''بُو'' طبع ہوا۔ اس پر مالکانِ ادبِ لطیف کے ساتھ منٹو اور قاسمی دونوں کو عدالت میں طلب کیا گیا۔ بقول احمد ندیم قاسمی ☆، جج نے منٹو اور احمد ندیم قاسمی سے پوچھا گلستان اور بوستان پڑھی ہیں دونوں کا جواب اثبات میں تھا، جج نے کہا اس کے باوجود اتنی گندی کہانیاں لکھتے ہو۔ ان دونوں کو تو معاف کر دیا گیا لیکن ادبِ لطیف کو جرمانہ ادا کرنا پڑا۔

فیاض صاحب کا کہنا ہے کہ شاہد احمد دہلوی پر مقدمے کا ذکر انہوں نے اس لیے کیا ہے تاکہ منٹو اور شاہد دہلوی کے گہرے تعلق کو واضح کر سکیں اور ''اسی تعلق کی نسبت سے ہم شاہد احمد دہلوی سے اس بات کی توقع نہیں کر سکتے کہ وہ غلطی سے کسی ایسے افسانہ کو منٹو کے نام سے اپنے جریدہ میں طبع کرتے جو سرے سے منٹو کا نہ ہو''۔ گزارش ہے کہ وہ واقعی ایسی غلطی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ منٹو اور ساقی دونوں کی اپنی ایک Reputation بہر حال تھی اور ہے اور یہ افسانہ منٹو کی زندگی ہی میں ساقی سے پہلے ادبِ لطیف میں شائع ہو چکا تھا۔ ان دنوں ادبِ لطیف کا حلقۂ قارئین بھی بہت وسیع تھا اس لیے وہ غلطی نہیں کر سکتے تھے۔

فیاض صاحب نے اپنی تحقیق کے لیے ایک دلیل یہ بھی دی ہے کہ ''افسانے کا سیدھا سادہ، قدرتی اور بے ساختہ اُسلوب اور مکالمے، موضوع، کردار نگاری، ٹیکنیک، فضا اور فنکاری سب چیخ چیخ کر اعلان کر رہے ہیں کہ یہ منٹو کا افسانہ ہے۔'' فاضل محقق یہاں کچھ جذباتی ہو گئے ہیں، افسانے کو چیخ و پکار کرنے کی ضرورت قطعی نہیں ہے کیوں کہ یہ بے چارہ منٹو ہی کا افسانہ ہے۔

(ڈاکٹر شگفتہ حسین۔ ملتان)

☆ یہ بات احمد ندیم قاسمی صاحب نے مجھے ایک انٹرویو میں بتائی جو انہوں نے جولائی ۱۹۹۷ء میں لاہور میں دیا۔

''انگارے'' مئی ۲۰۰۶ء اور جون ۲۰۰۶ء موصول ہوئے۔ سہ ماہی کتابی سلسلہ ''شاعری'' جولائی ۲۰۰۶ء اپنے تکمیلی مراحل میں ہے اس لیے زیادہ مشغول ہوں۔ ''انگارے'' بس اِدھر اُدھر سے دیکھ سکا ہوں۔ مئی ۲۰۰۶ء کے شمارے میں آپ نے میری دو غزلیں شائع کی ہیں۔ میری پہلی غزل کے پہلے مصرعہ میں ''معنیٰ'' کمپوز ہوا ہے حالاں کہ ''معانی'' ہونا چاہیے تھا۔ دوسری غزل کے تیسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں لفظ ''پڑی'' کمپوز نہ ہو سکا اور اس طرح مصرعہ ساقط ہو گیا۔ مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا: ''گرہ جو دل میں پڑی ہے نہ کھل سکی کیوں کر'' بہر نوع یہ بھی ممکن ہے کہ میرے ہی لکھنے میں ایسا ہو گیا ہو۔

(سہیل غازی پوری)

مئی و جون کے شمارے موصول ہو گئے۔ مئی کے شمارے میں ظفر اقبال سے متعلق میرا خط شائع کر دیا ہے اس کا شکریہ۔ ایک جگہ فاعلن کی جگہ فعلن لکھا گیا ہے جو قلم کی غلطی ہے۔ بہر حال انتظار ہے شعرا کی آراء کا۔ مجھے انتہائی خوشی ہوتی ہے انگارے کو پڑھ کر۔ اس میں آپ کی کاوشوں اور سب سے بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ آپ ادب میں بالکل غیر جانب دار ہیں اور ہر ایک کے خیالات یا نظریات کو جگہ دیتے ہیں۔ ہر شاعر اور ادیب اپنی ایک الگ سوچ رکھتا ہے۔ تھوڑی بہت خیالاتی مماثلت ہو سکتی ہے مگر بالکل ہم آہنگی ناممکن ہے۔ جس طرح انسانوں کے چہرے، آوازیں یہاں تک کہ چالیں مختلف ہیں اُسی طرح زاویۂ فکر نیز خیالات بھی جدا جدا ہیں۔ کسی کو کچھ پسند ہے تو کسی کو کچھ اور۔ میں آپ کی لگن اور محنت کی داد دیتا ہوں۔ بغیر اشتہار کے پرچے نکالنا حیرت ہوتی ہے یہاں تو اشتہارات کے حصول کے بعد بھی مدیران روتے اور منہ بسورتے رہتے ہیں۔ خدا آپ کی مدد فرمائے۔ پرچے میں شامل تمام مضامین کافی پسند آئے۔ پرچہ زندہ اور پائندہ رہنا چاہیے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔

(شارق بلیاوی۔ کراچی)

☆☆☆

رسید و اطلاع:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)، ڈاکٹر علی ثنا بخاری (لاہور)، غلام حسین ساجد (لاہور)، قاضی جاوید (لاہور)، اافتخار عارف (اسلام آباد)، ناصر بخاری (اسلام آباد)،، حصیر نوری (کراچی)، فہیم شناس کاظمی (نواب شاہ)، ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں (پشاور)، صابر عظیم آبادی (کراچی)،، کاشف مجید (اوکاڑہ)، تنویر صاغر (لاہور)، ڈاکٹر افتخار بیگ (لیہ) ڈاکٹر علمدار بخاری (سرگودھا)، محمد امین الدین (کراچی)، نسیم عباس (ساہیوال)، مشتاق شبنم (کراچی)، رشید علی علوی (خوازہ خیلہ، سوات)، وارث خان (منگورہ، سوات) سَید شیر مہمند (پشاور)، ایم فیاض خالد (گجرات)، جسارت خیالی (لیہ) انور جاوید ہاشمی (کراچی)، احمد اعجاز (لیہ) مزمل حسین (لیہ)

موصول شدہ کتب و رسائل

۱۔	سرمئی لکیریں	اِریج مبارک	(نظمیں)
۲۔	جوئے شِیر	پرویز ساحر	(شعری مجموعہ)
۳۔	آس بے آس	شارق بلیاوی	(غزلیات)
۴۔	بارِ خدا	محمد امین الدین	(ناول)
۵۔	لازماں سے زماں تک	جسارت خیالی	(ڈاکٹر خیال امروہوی۔ شخصیت و فن)
۶۔	دُرِ دِجامِ حیات	شبیر احمد قادری (مرتبہ)	(حکیم شاعر قدوائی کے حوالے سے مضامین)
۷۔	تم اداس مت ہونا	نذیر تبسم	(شعری مجموعہ)
۸۔	دل دسواں سیارہ ہے	طارق ہاشمی	(شعری مجموعہ)
۹۔	جدید نظم کی تیسری جہت	طارق ہاشمی	(تنقید)

۱۰۔	''دنیا زاد'' کراچی (کتاب ۱۷)	آصف فرخی (مرتب)
۱۱۔	سہ ماہی ''نوادر'' لاہور (۱۷۔۱۶)	ڈاکٹر گوہر نوشاہی (مدیر اعلیٰ)
۱۲۔	ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور (جون ۲۰۰۶ء)	اظہر جاوید (مدیر)
۱۳۔	ماہنامہ ''اخبارِ اردو'' اسلام آباد (جولائی ۲۰۰۶ء)	سردار احمد پیرزادہ (مدیر)
۱۴۔	ماہتاک ''سنگت'' کوئٹہ (جون ۲۰۰۶)	شاہ محمد مری (ایڈیٹر)
۱۵۔	سہ ماہی ''تسلسل'' پشاور (۲)	طارق ہاشمی (مرتب)

☆☆☆